آغا سہیل

آغا سہیل کی افسانہ نگاری کے تین ادوار ہیں ۔

پہلا، جب انہوں نے ۴۹ - ۴۸ء میں برصغیر کے نامور ادیبوں کے سائے میں لکھنا اور چھپنا شروع کیا لیکن ناپختہ عمر کے سبب ۱۹۵۴ء تک کے افسانوں کو کتابی شکل میں چھپوانا پسند نہیں کیا ۔

دوسرے دور (۱۹۵۵ء سے ۱۹۷۴ء) تک کے افسانوں کا انتخاب "بدلتا ہے رنگ آسماں" کے عنوان سے شائع کیا ۔

دوسرے اور تیسرے دور کے مابین جو عبوری زمانہ ہے وہ ۱۹۷۵ء تا ۱۹۸۱ء پھیلا ہوا ہے چنانچہ اسی عبوری دور کے افسانوں کو "شہر ناپرساں" کے عنوان سے مرتب کیا گیا ہے ۔ البتہ تیسرا مرحلہ بے حد اہم ہے اور وہی آغا سہیل کی افسانہ نگاری میں ایک اہم موڑ بھی ہے جسے "عہدِ زوال" کے نام سے عنقریب پیش کیا جائے گا ۔

HaSnain Sialvi

آغا سہیل

سنگِ میل پبلی کیشنز۔ چوک اردو بازار۔ لاہور

باراوّل :۔ جنوری ۱۹۸۳ء
قیمت :۔ ۲۵ روپے
طابع :۔ سندھ ساگر پرنٹرز۔ لاہور
ناشر: نیاز احمد
سنگ میل پبلی کیشنز۔ لاہور
کتابت: اشفاق احمد

HaSnain Sialvi

شور صہبائی کے نام

HaSnain Sialvi

مصنف کے کوائف!

نام : آغا سہیل

تاریخ پیدائش : ۶ جون ۱۹۳۳ء

تعلیم : ایم۔اے (لکھنؤ یونیورسٹی) پی ایچ ڈی (پنجاب یونیورسٹی، لاہور)

پیشہ : تدریس

مشغلہ : تصنیف و تالیف

پتہ : (i) اسسٹنٹ پروفیسر و صدر شعبۂ اُردو، ایف سی کالج لاہور ۱۶

(ii) ۲۳۔ ایف سی کالج لاہور ۱۶

اقامتی فون : ۸۸۲۹۱۶

○ ○
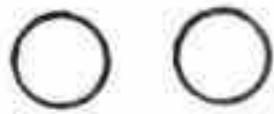
تصانیف

۱۔ غبار کوچۂ جاناں

۲۔ بدلتا ہے رنگ آسماں

۳۔ معارف سہیل

۴۔ سرور سلطانی

۵۔ اردو کا لسانی خاکہ

۶۔ شہر نا پرساں

۷۔ دبستان لکھنؤ کے داستانی ادب کا ارتقاء

دیگر!

الف : جرمن ہمعصر افسانے

ب : آل رضا کے مراثی

ج ۔ اختیاری اردو (نظم) | پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ، لاہور

د ۔ 〃 〃 (نثر) | پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ، لاہور

متفرق مضامین، مقالات، خاکے، ڈرامے، مقدمے، دیباچے اور فلیپ وغیرہ

HaSnain Sialvi

پیش لفظ

'شہرِ نا پرساں' میرے افسانوں کا دوسرا مجموعہ ہے، پہلا مجموعہ 'بدلتا ہے رنگ آسماں' ۱۹۷۵ء میں شائع ہوا، جس میں یارِ دیرینہ حسن عابد کے مساعیٔ جمیلہ کو یہ دخل تھا کہ ۱۹۵۵ء سے ۱۹۷۴ء تک کے افسانوں کا انتخاب انہوں نے بہ نفسِ نفیس خود کیا، اور محمد علی صدیقی سے صاد کراتے گئے، نیز یہ حسن عابد ہی تھے جنہوں نے مجھے 'سہیل ادیب' سے 'آغا سہیل' بنایا یعنی ایک مصنوعی نام سے مجھے چھٹکارا دلا کر میرے اصل نام سے لکھنے کا مشورہ دیا، یہ مرحلہ ۱۹۵۵ء میں طے ہوا، اگرچہ میرے لکھنے اور چھپنے کا سلسلہ ۱۹۴۸ء سے جاری تھا، لیکن عمداً ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۴ء تک کے افسانوں کو نظر انداز کیا گیا ہے۔

میرے پہلے مجموعے میں کوئی دیباچہ یا پیش لفظ شامل نہیں تھا، میں اب بھی اس کا قائل نہیں ہوں۔ میرے ناول غبارِ کوچۂ جاناں میں بھی یہ تکلف موجود نہیں کیونکہ میں یہ چاہتا ہوں کہ قارئین براہِ راست میری تخلیق سے رابطہ قائم کریں اور میرے نقطۂ نظر سے مطلقاً کوئی اثر قبول نہ کریں، ناقدین اور مبصرین کو بھی مرعوب کرنا مجھے ناپسند ہے، رہا یہ کہ میرے نقطۂ نظر کی وضاحت کیونکر ہو تو اس کے لیے مجھے عرض کرنے دیجیے کہ ایاز قدرِ خود بشناس کے مصداق مجھے اپنی طالب علمانہ حیثیت کا بخوبی احساس ہے اگر اس تخلیقی سفر میں کبھی میرے مساعی مشکور ہوئے تو قارئین خود ہی تقاضہ کریں گے ورنہ معاملہ جوں کا توں ہی رہنا چاہیئے۔ تاہم پاک و ہند کے ناقدین، مبصرین اور قارئین

نے جس فراخدلی سے میرے پہلے مجموعے کا خیر مقدم کیا اور لاتعداد تبصرے شائع کیے اور اُردو، انگریزی کے تقریباً تمام رسائل و جرائد، اخبارات نے ریویو شائع کیے۔ وہ محض ادب نوازی کا ثبوت ہیں۔ میں صمیم قلب سے اس توجہ فرمائی کا شکر گزار ہوں۔

شور صہبائی میرا بہت پرانا دوست ہے اور مجھ سے پہلے سے اس صنفِ نثر کی کوچہ گردی کر رہا ہے۔ ۱۹۴۷ء میں اس کے افسانوں کا ایک مجموعہ 'کانٹے' چھپا تھا، پھر آج تک دس دس پانچ پانچ سال کے وقفوں سے اس کے افسانے چھپتے رہے۔ بیشتر قارئین افسانہ اس کا نام تک فراموش کر چکے ہیں لیکن میں اپنے اس دوسرے مجموعے کو اپنے اس دیرینہ ہم سفر کے نام معنون کرنے کی عزت حاصل کر رہا ہوں جس نے میرے ساتھ اس کوچے کے بہت سے ہفتخوان طے کیے اور آج اردو افسانے کا ایک گمنام اہرام بنا بیٹھا ہے جو نہ منہ سے بولتا ہے نہ سر سے کھیلتا ہے۔

آغا سہیل

یکم جنوری ۱۹۷۹ء

HaSnain Sialvi

فہرست

HaSnain Sialvi

فاصلہ

گلابی جاڑوں میں صبح اور شام کے اوقات ہر لحاظ سے دلکش اور نہایت درجہ مسحور کن ہوتے ہیں صبح کی دھند کے دودھیالے پس منظر میں سورج کی شعاعیں بھلی معلوم ہوتی ہیں اور شام کی سرمئی آنچل میں شفق کے پھول کیسی بہار دکھلاتے ہیں ظاہر ہے کہ ان اوقات میں باوجود اپنی پیرانہ سالی اور باوجود اپاہج ہونے کے نہ میں اپنی لائبریری میں یکسوئی سے پڑھ سکتا ہوں نہ ڈرائنگ روم میں بخاری کے سامنے بیٹھ کر آگ تاپ سکتا ہوں وہ جو میرے اندر چھپا ہوا ایک شاعر بیٹھا ہے مجھے اکساتا رہتا ہے کہ اپنی پہیوں والی کرسی کو خود ہی دھکیل کر برآمدے میں پہنچ جاؤں اور سامنے سپیدار کے فلک بوس درختوں سے جھانکتے ہوئے آسمان پر نگاہیں گاڑ دوں جہاں پرندوں کی ٹولیوں کی ٹولیاں اور پرے کے پرے اڑتے ہوئے ایک سمت سے دوسری سمت پرواز کرتے چلے جا رہے ہوتے ہیں اس سے زیادہ میری نگاہ کی وسعت معلوم کیونکہ برآمدے کے باہر میری پہنچ ممکن نہیں نہ اس بڑھاپے میں ایسا کوئی رفیق ہے جو میری ناز برداریاں کرے اور مجھے سیر کراتا پھرے۔ میں اس کو بھی غنیمت سمجھتا ہوں کہ برآمدے تک پہنچ کر آسمان کو دیکھ سکتا ہوں اپنے کمروں میں دریچے کھول کر بھی آسمان کا نظارہ کر سکتا ہوں اور گاہے گاہے بستر پہ دراز ہو کر روشندانوں کے راستے آسمان کے مختلف نظارے کر سکتا ہوں اس سے زیادہ کی ہوس ایک اپاہج اور پنشن یافتہ فوجی شخص کو جس کا کوئی یار یا دوست اس شہر میں موجود نہ ہو غالباً نہیں کرنی چاہیئے میں مطمئن ہوں اور حد درجہ طمانیت محسوس کرتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ بقیہ

زندگی کے ایام اسی طرح تیر کروں گا۔ رہا یہ مسئلہ کہ اگر میں نے شادی کر لی ہوتی تو آج یہ تنہائی نہ ہوتی میرا قطعاً مسئلہ نہیں ہے میرے چند دوستوں کا ضرور میرے بارے میں یہی خیال ہے ان کا یہ بھی خیال ہے کہ روزی سے میری دقیانوسی اور افلاطونی محبت نری بکواس ہے جس میں مجھے سراسر ناکامی ہوئی اور روزی مجھ سے بہتر آدمی سے شادی کر کے عیش کر رہی ہے اور اب تو اس کی اولاد کی اولاد بھی ہو چکی ہے جبکہ میں ایک ایسے سوکھے درخت کی مانند ہوں جس پر کوئی بیل بھی نہیں چڑھتی وغیرہ وغیرہ، لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ قطعاً میرا مسئلہ نہیں ہے یہ درست ہے کہ روزی نے مجھ سے اور میں نے روزی سے ٹوٹ کر محبت کی اور دونوں نے خوب ایک دوسرے کو چاہا اور پیار کیا اور پھر اپنی مرضی سے بچھڑ گئے کہ میرے نزدیک شادی محبت کی موت ہے اور "محبوبہ" کو اس بلند منصب سے معزول کرنا ہے چنانچہ میں آج بھی خوش اور مطمئن ہوں میرے دل میں آج بھی روزی کی محبت کی شمع روشن ہے اور یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس کے دل میں بھی میری محبت کا خزانہ مدفون ہے۔

میں آپ سے ہرگز یہ تقاضا نہیں کروں گا کہ آپ مجھ سے ضرور اتفاق کریں لیکن میں آپ سے یہ توقع ضرور کروں گا کہ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں اور آزادی کے ساتھ مجھے مرنے اور جینے کا حق دیں میں جی بھر کے جی چکا ہوں اور اب اطمینان سے مرنے کے لئے ریٹائرڈ زندگی گزار رہا ہوں اپنی نیند سوتا ہوں اور اپنی مرضی سے جاگتا ہوں۔ نہ میرا کوئی مزاحم ہے نہ میں کسی کے حکم کا انتظار کرتا ہوں۔ فوجی زندگی کا معتدبہ حصّہ بھی حکم دینے "زیادہ" اور حکم لینے "کم" گزرا، اب چھوٹی چھوٹی خوشیاں میری زندگی میں اہمیت رکھتی ہیں۔ معمولی معمولی غم مجھے پہاڑ معلوم ہوتے ہیں لیکن غالباً یہ خوشیاں اور یہ غم زندہ رہنے کے لئے ناگزیر ہیں شاید میں نے جینے کا گر معلوم کر لیا ہے کارنس پر رکھے ہوئے گھونسلے سے چڑیا کا ایک بچہ بھی نیچے گر جائے تو مجھے اس وقت تک چین نہیں آتا جب تک کہ

دوبارہ وہاں اسے پہنچا نہ دیا جائے اور اس کے ماں باپ اسے اپنی چھاتی سے لگا کر چھپانے نہ لگیں اگر ان گھونسلوں سے انڈے گر کر ٹوٹ جاتے ہیں تو کئی کئی دن تک مادہ چڑیا کی پریشانی مجھ سے دیکھی نہیں جاتی۔ بظاہر یہ کتنی عجیب بات ہے کہ ایک ایسے فوجی شخص کی نرم دلی کا یہ عالم ہو جس نے بعض معرکوں میں ہزارہا دشمنوں کو بے رحمی سے بھون کر رکھ دیا ہو لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ایک فوجی بہر حال ایک انسانی اور بنیادی طور پر محض ایک انسان ہوتا ہے، وہ قسی القلب نہیں ہوتا جس وقت وہ دشمنوں پر ٹوٹ پڑتا ہے اور توپوں بندوقوں اور گولوں سے دشمن کو بھون ڈالتا ہے تو اس وقت بھی انسان ہی ہوتا ہے لیکن اس وقت کی نفسیات اسے ایسا کرنے پر مجبور کر دیتی ہے کہ اسی میں اس کی مفر ہے یعنی فوجی کی نفسیات غالباً یہ ہے "مارو ورنہ مارے جاؤ گے" امن میں عام انسان کی نفسیات اور فوجی کی نفسیات میں کوئی فرق نہیں ہوتا اور مجھے کہنے دیجئے کہ ان دنوں میں ایک عام انسان کی نفسیات کے سہارے زندہ ہوں یا زندہ رہنے میں مگن ہوں۔ میری چھوٹی چھوٹی خوشیاں ہیں اور چھوٹے چھوٹے غم جو مجھے زندہ رکھے ہوئے ہیں۔

آپ شاید یہ سمجھے ہوں کہ صبح اور شام آسمان تکنے کے سوا اور مجھے کچھ نہیں آتا۔ یا صرف کتابیں پڑھ لیتا یا صرف اپنے لئے کھانا تیار کر لیتا ہوں، بے شک یہ سب میرے معمولات ہیں اور ان معمولات میں جزوی تبدیلیاں بھی ہوتی رہتی ہیں مگر ان کے علاوہ بھی میرے بہت سے مشاغل ہیں مثلاً میں البم نکال کر بیٹھ جاتا ہوں اور اسی طرح ماضی کے حسین لمحات میں دو چار گھڑیاں ہنسی خوشی گزار لیتا ہوں۔ احباب کو خطوط لکھتا ہوں یا ان کے خطوط پڑھتا ہوں اخبارات پڑھتا ہوں اور ہر خاص و عام کی طرح دنیاوی سیاست پر اپنی ایک رائے بھی رکھتا ہوں یہ بھی سوچتا رہتا ہوں کہ اگر امریکہ مجھ سے مشورہ مانگے تو فلاں فلاں معاملے میں یہ نکتہ سمجھاؤں۔ روس مشورہ طلب کرے تو یہ بات بتاؤں لیکن ظاہر ہے کہ روس یا امریکہ نہ مجھ سے مشورہ کرتے ہیں نہ میں انہیں مشورہ دیتا ہوں اور یہ بھی

سمجھتا ہوں کہ دنیا کے معاملات میری مرضی کے تابع نہیں ہو سکتے اپنے اپنے مصالح کو ہر
ملک بخوبی سمجھتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ میں آپ کو اپنی تازہ ترین دلچسپی سنانا چاہتا ہوں اور وہ
ہے روزی۔

روزی کے نام سے آپ پھر چونکے ہوں گے میں بھی پہلے پہل اس نام سے چونکا تھا۔ جب
اس کی ماں نے اسے روزی روزی کہہ کہ آواز دی تھی تو میں اچنبھے میں پڑ گیا تھا۔
لیکن یہ وہ روزی نہیں جو میری زندگی میں عجوبہ بن کر آ چکی تھی یہ تو ایک پیاری سی پھول سی
بچی کا نام ہے۔

گلابی جاڑے کی ایک اداس شام کو جب میں برآمدے میں بیٹھا آسمان کو تک رہا تھا
اور اپنا پائپ پی رہا تھا تو یہ ننھی سی پھول سی بچی میرے بنگلے کے گیٹ پہ آ کر کھڑی ہو گئی۔
وہ صریحاً مجھے تک رہی تھی۔ جب میری نگاہ اس پہ پڑی تو میں نے نہایت انہماک سے اپنی طرف
اسے نگراں پایا میں ہولے سے مسکرا دیا۔ بچی بھی ہنس دی میں نے اسے اشارہ کیا اور
بلایا بچی بلا تامل میرے پاس چلی آئی یہ کوئی چھ سات سال کی نرم نرم سبک سبک مکھن کی سی ملائم
جلد رکھنے والی گول مٹول سی بچی تھی میں اس کا نام پہلے ہی سن چکا تھا ایک روز سڑک پر کھیل
رہی تھی تو اس کی ماں نے اسے روزی کہہ کر پکارا تھا میں نے اس کے پیارے پیارے ہاتھ
اپنے ہاتھ میں لے کر آہستہ سے پیار کیا اور کہا "روزی"

وہ بولی: "ارے آپ تو میرا نام بھی جانتے ہیں"

میں نے کہا: "ہاں لیکن تم نہیں جانتیں میرا نام ۔ ؟"

"آپ کا نام؟" اس نے آنکھیں بند کر کے ذہن پہ زور دیا اور پھر نفی میں گردن ہلا دی
"نہیں!"

میں نے اس کے ہاتھ کو آنکھوں سے لگا کر کہا: "میرا نام ہے گرینڈ پا!"

"گرینڈ پا.." اس نے اپنے معصوم ہونٹوں سے کہا تو لگا کہ سچ مچ میرا یہی نام ہے۔

میں نے اپنی وہیل چیئر (WHEEL CHAIR) کو آہستہ سے ریلتے ہوئے کہا "دیکھو گڑیا رانی آج میں تم کو ٹافیاں نہیں کھلا سکتا، ہاں کل کھلاؤں گا۔ مگر تم چاہو تو انڈے کا حلوہ کھا سکتی ہو۔"

اس نے میری وہیل چیئر کو دلچسپی سے دیکھتے ہوئے کہا "آہا آپ تو بیٹھے بیٹھے چل لیتے ہیں۔"

میں اسے ڈائننگ روم میں لے آیا چھوٹے سے فریج کو کھول کر انڈے کے حلوے کی ڈش سے تھوڑا سا حلوہ لیکر طشتری پر رکھا بچی کو چمچہ دے کر اپنے سامنے بٹھا کر نیپکن ڈال دیا۔ وہ مزے لے لے کر حلوہ کھانے لگی۔ معاً اس کے ہاتھ رک گئے میں نے گھوم کر پیچھے دیکھا تو اس کی ماں کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے سیاہ رنگ کی میکسی پہن رکھی تھی۔ اس کے چہرے پر جوانی کی چمک بھی تھی اور اداسی کی ایک لہر بھی۔ وہ متواتر بچی کو فہمائشی انداز میں گھور رہی تھی۔ بچی نے آہستہ سے چمچہ رکھ دیا اور دھیرے سے کرسی سے اتر گئی اور دوڑ کر ماں کے پاس پہنچ گئی۔ میں نے بچی کی وکالت کرتے ہوئے کہا "بڑی پیاری بچی ہے۔"

بچی کی ماں نے نہایت ملائمت سے میرا شکریہ ادا کیا بچی کی انگلی پکڑی اور چلی گئی میں حد نظر تک بچی اور اس کی ماں کو تکتا رہا اور یہ سوچ سوچ کر کڑھتا رہا کہ روزی کو انڈے کے حلوے کی قیمت ماں کی فہمائش کی صورت میں ادا کرنی پڑے گی وہ روز تک صبح و شام میں نے روزی کا انتظار کیا لیکن وہ نہ آئی تیسرے دن صبح صبح ٹافیوں کے پارسل گفٹ پیپر میں لپیٹ کر اور فیتے میں باندھ کر میں نے ایک چٹ پہ لکھا "گرینڈ پا کی طرف سے اپنی گڑیا رانی کے لئے پیار اور محبت کے ساتھ۔" اور صفائی کرنے والی چھوکری کو سمجھا بجھا کر پڑوس کی کوٹھی میں تحفہ بھیجدیا۔ تحفہ وصول کر لیا گیا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد روزی کو اس کی ماں خود لے کر آئی اور بولی "انکل کا شکریہ ادا کرو۔"

بچی نے کہا کہ "ممی یہ میرے انکل نہیں ہیں۔ یہ تو گرینڈ پا ہیں۔"

میں نے بچی کو جھک کر اٹھایا اور اپنی وھیل چیئر پر بٹھا کر پیار کیا اور اس کی ماں سے مخاطب ہو کر کہا "میں اپنی روزی کا گرینڈ پا ہوں۔ مسز ۔ ۔ ۔ ؟" "مسز ۔ ۔ ۔ ؟"

"مسز صادق" اس نے جملہ پورا کیا "آپ کے پڑوس میں دو ہفتے سے رہتی ہوں۔ روزی کے باپ فوج میں میجر ہیں ان دنوں انڈیا کی قید میں ہیں روزی بچی خالہ کی بھیجتی ہے، وہ جی لوگ مصر ہیں کہ صادق کے لوٹنے تک ہم یہیں رہیں گے۔"

میں نے روزی کی تھوڑی پر جھولے سے ٹہوکا دیا اور بولا "آپ نے بہت اچھا کیا مسز صادق" میں نے مناسب سمجھا کہ اپنا بھی مختصر سا تعارف کرا دوں ورنہ یہ بد تہذیبی ہوگی "میں بھی فوج کا ریٹائرڈ کرنل ہوں۔ مجھے فریدی کہتے ہیں۔ ایک موقع پر میری ٹانگ میں شل لگا تھا تو ٹانگ کو کاٹنا پڑا۔ یہاں تنہا رہتا ہوں ۔ روزی کو کبھی کبھی بھیج دیا کیجئے وہ بڑی پیاری بچی ہے۔"

میں نے توڑ توڑ کر فقرے ادا کئے پھر مجھے معا خیال ہوا کہ میں نے میجر صادق کے بارے میں کچھ بھی نہیں کہا۔ بطور ہمدردی مجھے ضرور کچھ کہنا چاہیئے "دراصل میں نے تمہیداً کہا "دوسری جنگ عظیم میں مجھے بھی برما کے محاذ پر جاپانیوں نے گرفتار کر لیا تھا میرے ساتھ اور بھی کئی ساتھی تھے۔ اس وقت میں سیکنڈ لفٹیننٹ تھا آپ سوچ بھی نہیں سکتیں کہ وہ کتنی اذیت دہ قید تھی ۔ مگر ہم فرار ہو گئے" میں زور سے ہنسا "اور اگر ہم فرار نہ ہوتے تو آج میں آپ کے سامنے موجود نہ ہوتا"

میں نے دیکھا کہ عورت خاصی متاثر تھی غالباً وہ اپنے شوہر کے بارے میں سوچ رہی تھی میں نے سوچا کہ مجھے اس کو تسلی دینا چاہیئے "مسز صادق اس وقت جنیوا کنونشن بھی موجود نہ تھا۔ آپ تسلی رکھیں میجر صادق بالکل بخیریت ہیں بہت جلد وہ واپس آجائیں گے اور اپنی روزی کے لئے ڈھیر سے کھلونے لائیں گے ۔ ڈھیر سے۔"

روزی نے میرے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں لے کر کہا۔ گرینڈ پا ڈیڈی نے

سے احساس بھی ہے باضمیر قوموں نے اس کے خلاف احتجاج بھی کئے ہیں لیکن استعماری نظام کا حصار تو نظر بھی نہیں آتا غرضیکہ قید جس کو ہم قید سمجھتے ہیں وہ زندان میں نہیں لیکن وہ قید و بند جن میں ہم محصور ہوتے جا رہے ہیں شاید اس کا سلسلہ لامتناہی ہے۔

غرضیکہ میرے پاس روزی کی آمد و رفت شروع ہو گئی اور اس آمد و رفت کا محرک تھی میں تو بہت ہی خوش اور مطمئن تھا کہ میرے لئے ایک معصوم شغل نکل آیا اور روزی اس لئے کہ اسے اپنے گھر کے سوگوار ماحول سے نجات مل جاتی تھی۔ یہاں باتوں میں رجائیت کا پہلو اب کم رہتا۔ جبکہ غالباً اس گھر میں مایوسی گھٹن کا احساس غالب رہتا ہوگا خیال ہے روزی کی ماں اپنے شوہر کو یاد کر کر کے روتی بھی ہوگی۔ جس کا لازمی اثر بچی پر پڑتا۔ بچے فطرتاً رجائیت پسند ہوتے ہیں غم و الم کے کرب میں بھی امید کی کوئی نہ کوئی کرن ان کو نظر آتی ہے روزی نہایت تواتر سے میرے پاس پہنچتی اور دن میں کئی کئی بار میرے پاس آتی۔ اکثر تو کئی کئی گھنٹے میرے ساتھ گزارتی اور اپنی معصوم باتوں سے مجھے رجھاتی۔ ہنساتی اور قہقہے لگانے پر مجبور کر دیتی اس طرح مجھے وقت کا احساس تک نہیں ہوتا تھا۔

میں نے بھی بچی کے لئے طرح طرح کے مشغلے پیدا کر دیئے تھے۔ گھر میں پائپ پڑے ہوئے تھے ایک فوجی انجینئر دوست کے سہارے انہیں موڑ کر نواڑ کا جھولا اس میں ٹکا دیا تھا روزی پہنچتے ہی جھولے میں بیٹھ کر جھولنا شروع کر دیتی اور مجھ سے الٹ پٹ باتوں کا سلسلہ شروع کر دیتی تو ختم ہونے کی نوبت ہی نہ آتی مثلاً جھولے پر جھولتے وقت اس کے ذہن میں طرح طرح کے نت نئے خیالات آتے رہتے اور وہ بے تکان ان خیالات کو بے تکلفی سے الفاظ کا جامہ پہناتی رہتی۔ ایک روز جھولا جھولتے جھولتے بولی "گرینڈ پا اگر آسمان کی دھنک کا جھولا بنایا جا سکے تو کیا ہم پینگ لگاتے وقت اللہ میاں سے باتیں کر سکتے ہیں؟

"اللہ میاں سے ؟" میں پوچھتا۔ "ہاں کیوں نہیں ـــ لیکن جب ہم نماز پڑھتے ہیں نا تو یہ اللہ میاں سے باتیں ہی تو ہوتی ہیں"!

"اچھا ؟"

"ہاں بالکل"!

"مگر گرینڈ پا، اللہ میاں تو جواب ہی نہیں دیتے"!

اچانک وہ جھولے سے کود کر میرے پاس آئی اور رازدرانہ انداز میں بولی۔

گرینڈ پا اللہ میاں کو ٹیلی فون نہیں کیا جا سکتا ؟ــــــ میں نے دیکھا تھا چاند پہ صدر نکسن نے ٹیلی فون کیا تھا ناــ"

"تم اللہ میاں سے بات کرنا چاہتی ہو ؟"

"ہمنہ" وہ بولی "میں ان سے بہت سی باتیں پوچھنا چاہتی ہوں"!

"جیسے ؟"

"جیسے" وہ قدرے گھبرا گئی اور آہستہ سے لفظ چبا چبا کر بولی۔ "میں پوچھنا چاہتی ہوں، میرے پیارے اللہ میاں آپ آسمان پہ کیوں رہتے ہیں، میرے پیارے اللہ میاں آپ میرے پاس کیوں نہیں آتے۔ مجھے اچھی اچھی کہانیاں کیوں نہیں سناتے میرے ڈیڈی کو مجھ سے نہیں ملاتے ـــــ میرے گرینڈ پا کی ٹانگیں کیوں نہیں ٹھیک کر دیتے میرے ڈیڈی نے جو گڑیا دی تھی اس کو زبان کیوں نہیں دیتے"!

میں ہنسنے لگا بھئی اتنی باتیں تم فون پہ کرو گی، اللہ میاں سے تو فون کا بل تو لاکھوں کا آئے گا ــــ آخر ٹرنک کال ہو گی نا!"

اسی طرح روزی مجھ سے پھولوں تتلیوں پرندوں قوس و قزح اور گڑیوں وغیرہ کے بارے میں عجیب عجیب باتیں کرتی رہتی مجھ سے کہانیاں سنتی، قصے اور لطیفے سنتی، پیاری پیاری پہیلیاں بوجھتی، مجھ سے لاڈ پیار کرتی، ضدیں کرتی، نخرے اور ناز کرتی

اور میں خوشی خوشی ساری باتیں پوری کرتا بلکہ خود مجھے یوں محسوس ہوتا کہ روزی کا مجھ پر حق ہے کہ وہ ایسی باتیں کرے۔ مسز صادق کا فرض ہے کہ روزی کی تمام ضدیں پوری کرنے کے لئے مجھ سے اور صرف مجھ سے رجوع کرے، جیسے میں سچ مچ اس کا دادا ہوں۔ جیسے سچ مچ مسز صادق میری بہو ہے، صادق میرا بیٹا ہے اور یہ بچی میری لاڈلی پوتی ہے۔

ایک رات میں بے خبر سو رہا تھا کہ کال بل زور زور سے بجی میں گھبرا کر اٹھا بمشکل وہیل چیئر پہ بیٹھ کر دروازے تک آیا۔ چٹخنی کھولی تو دیکھا مسز صادق بچی کو گود میں لئے کھڑی ہے اور قدرے فہمائشی انداز میں مجھ سے بولی "لیجئے سنبھالئے اپنی لاڈلی کو، روتے روتے سارا گھر پریشان کر دیا۔ کہتی ہے کہ گرینڈ پا سے لال پری کی کہانی سنوں گی ـــــ توبہ میرے اللہ آپ کو کس قدر پریشان کرتی ہے۔"

مسز صادق کے پیچھے کھڑی ہوئی اس کی بہن نے کہا "یہ تو اپنے باپ کو بھی بھول گئی ہے ایک تو سارے سارے دن آپ کے پاس رہتی ہے، گھر آتی بھی ہے۔ تو غیروں کی طرح اور کچھ بات کرو تو آپ کے بارے میں بات کرتی ہے۔"

میں نے بچی کو گود میں لے کر پیار کیا۔ اس نے میرے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ مسز صادق نے کہا "خبر ہے اس وقت رات کے گیارہ بج رہے ہیں۔"

میں نے کہا "آپ لوگ آرام سے جا کر سو جایئے۔ روزی میرے ساتھ سو جائے گی، کیوں گڑیا رانی ـــــ؟"

اس کے جواب میں بچی نے میری گردن کو زوروں سے بھینچ لیا گویا وہ نہایت گرمجوشی سے میری تجویز پر صاد کر رہی تھی بچی کی ماں نے کہا "اور اگر اس نے پیشاب کر دیا تو؟"

"میں نے کہا: کوئی بات نہیں بچی ہی تو ہے۔"

حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ میں بچوں کے پیشاب وغیرہ سے بہت گھبراتا ہوں، علاوہ ازیں آج تک مجھے کسی بچے کے ساتھ سونے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا تھا لیکن ہر چہ بادا باد۔

اب تو روزی کے اعتماد کو ٹھیس پہنچانے کی مجھ میں ہمت نہیں تھی۔ میں نے دونوں خواتین کو رخصت کر دیا اور بچی کو کہانی سنائی۔ چند لمحوں میں بچی مجھ سے چمٹ کر سو گئی کچھ دیر تو میں ایک ہی حالت میں پڑا رہا جب چاہا کہ بچی سے علیحدہ ہو کر وہیل چیئر پہ جا بیٹھوں اور اسی طرح صبح کر دوں تو بچی نے زوروں سے مجھے چمٹا کر گردن میں باہیں حائل کر دیں اور پیار سے سوتے میں بڑبڑانے لگی "ڈیڈی مجھے چھوڑ کر مت جاؤ، ڈیڈی پلیز، ڈیڈی" میرا جی بھر آیا میں نے سوتی ہوئی بچی کو کئی بار چوما اور خوب خوب چمٹا کر گلے لگا لگا کر کہا "میں نہیں جاؤں گا کہیں نہیں ——— تم اطمینان سے سو جاؤ، میری بچی میری گڑیا رانی"۔ بچی نہایت فراغت سے سوئی۔ صبح اٹھ کر میرے ساتھ ناشتہ کیا اور پھر اپنی ماں کے پاس چلی گئی۔ دن میں بدستور میرے گھر کے کئی کئی چکر لگاتی رہی، باتیں بگھارتی رہی اور معمولات بجالاتی رہی شام کو رخصت ہوئی اور گزشتہ شب کی بات میرے ذہن میں محو ہو چکی تھی لیکن جب رات میں بچی کی ماں پھر اسے لے کر آگئی تو میں سمجھ گیا کہ بچی کو میرے بغیر قرار نہیں آسکتا۔ شاید مجھ میں دادا والی جملہ صلاحیتیں پیدا ہو چکی تھیں میں نے بچی کو ماں کی گود سے لے کر پیار کیا اور بستر پہ لٹا کر خود بھی اس کے پہلو میں لیٹ کر سو گیا صبح ہوئی تو بچی بدستور میرے گلے کا ہار بنی ہوئی تھی۔ میں نے اسے پیار کر کے اٹھایا تو ہنستی ہوئی اٹھ بیٹھی۔

اس طرح روزی کا عمل دخل میرے پورے گھر پہ ہو چکا تھا وہ جو چاہتی تھی کرتی تھی اور جو چاہتی تھی مجھ سے کراتی تھی میرا گھر اس کے ایما پہ چلتا تھا اگر اس کی مرضی یہ ہے کہ صوفہ کو الٹ کر گڑیا کا گھر بنایا جائے تو ایسا ہی ہوتا تھا اگر وہ چاہتی کہ پینٹری میں کرکیٹ کھیلا جائے تو ایسا ہی ہوتا اگر اس کا جی چاہتا کہ ڈائننگ ٹیبل کو پنگ پانگ ٹیبل میں تبدیل کر دیا جائے تو میں سر تسلیم خم کر دیتا یہاں تک کہ میری گنجی کھوپڑی پہ سگریٹ کے پیکٹ سے پنی نکال کر چپکاتی تو میں چپ چاپ بیٹھا رہتا میرے گنجے سر کا لبے ہوئے

انڈے سے تشبیہہ دیتی تو میں خود بھی اس کی ہنسی میں شریک ہو جاتا یعنی ہم دادا اور پوتی کی منزلوں کو پھلانگ کر دو بے تکلف دوست بن چکے تھے اور اس تمام دوستی میں روزی کے ہاتھ میں میری حیثیت ایک بے جان گیند کی سی تھی جسے جب چاہے وہ کسی طرف لڑھکا دے

اس دلچسپ ڈرامے کا سین جس طرح ہوتا تھا مجھے اس کا بخوبی اندازہ تھا اور میں نے سچ پوچھیے تو اس کے لیے خود کو ذہنی طور پر تیار کر لیا تھا کہ ایک روز جب سارے قیدی ہندوستان سے آئیں گے تو روزی کا باپ بھی آ جائے گا اور اچانک روزی مجھے گڈبائی کہہ کر چلی جائے گی۔

پھر شاید کبھی ہماری ملاقات نہ ہو لہذا میرا دل کہتا تھا کہ اس بچی سے زیادہ پینگ بڑھانا اچھا نہیں ورنہ ایک نہ ایک دن اس سانحہ سے دوچار ہونا پڑیگا۔

ایک دن بچی بھاگتی ہوئی میرے پاس آئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک بنڈل تھا، ہانپتی ہوئی بولی "گرینڈ پا اس میں کیا ہے؟"

میں نے کہا "پتہ نہیں"

اس نے جھٹ بنڈل کھول کر ایک گڑیا نکال کر مجھے تھما دی اور بولی "یہ میرے ڈیڈی نے ہندوستان سے بھیجی ہے"

بعد میں پتہ چلا کہ کچھ بیمار زخمی قیدی پاکستان آ رہے تھے۔ ان میں سے کسی کو چھپا چھپو کر بچی کے باپ نے یہ گڑیا بھیجی تھی بچی کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا حالانکہ یہ بہت معمولی گڑیا تھی۔ اس سے بہت اچھی خوبصورت اور قیمتی گڑیاں بچی کے پاس موجود تھیں تو دیں نے بھی بعض اچھے کھلونے منگا منگا کر اسے دیئے تھے اس گڑیا کی قیمت بچی کی نظر میں کچھ اور ہی تھی

رات میں جب بچی میرے پاس سونے کیلیئے آئی تو وہ تنہا نہ تھی اس کے باپ کی بھیجی ہوئی گڑیا اسکے پاس تھی آج وہ میرے گلے میں باہیں ڈالکر نہیں سوئی اس نے گڑیا کے گلے میں باہیں حمائل کر دیں اور نہایت سکون و دلجمعی سے سو گئی۔ ایسی طمانیت میں نے اس سے پہلے کبھی اسکے چہرے پر نہ دیکھی تھی

نئی بستی

آج پھر بابا رمضان اس کچی سڑک کے موڑ پہ کٹے ہوئے درخت کے ایک تنے پہ سر نیہوڑائے بیٹھا تھا اور دور دور تک تا بحد نگاہ پھیلا ہوا خاموش اور سنسان آسمان کو گھور رہا تھا یہاں نہ درخت تھے نہ مکان نہ کھیت نہ باغ۔ بس سائیں سائیں کرتا ہوا سناٹا تھا اور بھائیں بھائیں کرتا ہوا چٹیل میدان۔

اب سے صرف چند سال قبل یہاں ایک نگری آباد تھی۔ کھیت بھی تھے اور باغ بھی، کچے پکے مکانات بھی تھے اور ان میں رہنے والے معصوم بچے، عورتیں، بوڑھے جوان سبھی تھے۔ گاؤں کا اپنا چھوٹا سا سکول تھا، مسجد تھی، جا بجا کنوئیں تھے۔ گاؤں میں ہر تہوار پہ میلوں ٹھیلوں کے جمگھٹے ہوتے، عرس منعقد ہوتے۔ قوالیاں ہوتیں، لڈی ناچی جاتی، بھنگڑا پڑتا، غرضیکہ گاؤں میں زندگی کا بھرپور نقشہ جما ہوا تھا اور آج دیکھو تو ہُو کا عالم طاری تھا، ہوا سنساتی ہوئی، سیٹیاں بجاتی ہوئی گزرتی تھی۔ اور یہاں کیسے سناٹے ہو سکتے تھے آسمان پہ کوئی پرندہ تک نظر نہ آتا تھا۔

یہ سارا جنگ نے پانسہ پلٹا تھا، دشمن نے سب کچھ ملیا میٹ کر دیا، باغوں کے درخت، کھیتوں کی فصلیں تہس نہس ہو گئیں۔ مکانات کا نام و نشان تک مٹ گیا، جب اس علاقہ کو دشمن نے خالی کیا تو اب جو لوگوں نے دیکھا تو صاف صاف آسمان صاف سرکار نے بستیاں بسانے میں مدد دی، کیمپ بنائے، عارضی مکانوں میں ابھی لوگ بسنے بھی نہ پائے تھے کہ ایک ارضی آفت اور ٹوٹی، سیلاب نے الف سے لیکر یے تک ہر شے

پہ پانی پھیر دیا۔ بابا رمضان نے بہتیرا چاہا کہ سیلاب گزرنے کے بعد دوبارہ لوگ آباد ہوں لیکن عجیب بات ہے۔ لوگوں میں سراسیمگی کچھ اس قدر پھیلی ہوئی تھی کہ اس بستی کا بسنا اب ناممکن سا نظر آیا کیونکہ یہ افواہ پھیلی ہوئی تھی کہ یہاں کسی بدروح کا سایہ ہے۔ اور جو بھی یہاں آکر دوبارہ بسے گا اس پہ آسیب سوار ہو جائے گا اور گاؤں کا گاؤں تباہ ہو جائے گا۔ مائی بھاتاں نے خواب میں کئی بار گاؤں پہ آگ برستی ہوئی دیکھی تھی۔ اور جب بھی خواب میں جھولی پھیلا کر دعا مانگی ہمیشہ اس کی جھولی میں کسی نے دہکتے ہوئے انگارے بھر دیئے اور گاؤں کے سب سے بوڑھے بابا ابراہیم نے صاف صاف کہہ دیا تھا

"لوگو! اس سرزمین سے دور رہو، اس پہ بار بار عذاب الٰہی نازل ہوگا" چنانچہ قریب ہی ایک جنگل میں جہاں کی زمین سنگلاخ، ناہموار اور ببول کے کانٹوں سے اٹی پڑی تھی لوگ وہاں خود اختیاری جلاوطنی کی زندگی گزارنے پہ مجبور ہو گئے تھے، بس ایک بابا رمضان تھا جو صبح سویرے اٹھتا اور سیدھا یہاں آکر بیٹھ جاتا۔ کبھی آسمان پہ بکھری خلاؤں میں تکتا رہتا اور کبھی زمین کے چٹیل میدانوں پہ نظر جمائے بیٹھا رہتا۔ کبھی کبھار کوئی آوارہ پرندہ بھٹکتا ہوا آسمان پہ نمودار ہو جاتا تو بابا رمضان کو ایک سے دوسرے کا سہارا ہو جاتا۔ لیکن یہ پرندہ بھی دوگنی تیز رفتار سے بھاگتا اور اڑتا ہوا کہیں غائب ہو جاتا۔ بھلا ایسی اجڑی بستی میں کون ٹھہرتا جہاں ایک درخت تک نہ ہو۔ کبھی کبھار کوئی مسافر طیارہ گزر جاتا تو اس کی آواز بازگشت دیر تک فضا میں مرتعش رہتی ورنہ بابا رمضان ہوتا یا اس کے نیچے زمین اور سر پہ آسمان۔

بابا رمضان نے اس گاؤں میں آنکھ کھولی تھی۔ اس کے آباؤ اجداد بھی اس جگہ کے پرانے باسی تھے۔ کیسے کیسے انقلاب اس گاؤں پہ آئے تھے کہ کبھی خشک سالی ہوئی اور قحط پڑ گیا لیکن لوگوں نے اپنی سرزمین کو نہیں چھوڑا۔ کیسے کیسے سیلاب آئے لیکن لوگ اونچے ٹیلوں پہ وقتی طور پہ پناہ گزین ہو گئے، پانی اترا اور وہ اپنی اپنی بستیوں

میں آ بسے، وبائیں پھوٹیں لوگ ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک رہے لیکن گاؤں نہیں چھوڑا۔ یہ کیسی افتاد آ پڑی تھی کہ لوگ گاؤں چھوڑ کر اور گاؤں سے منہ موڑ کر ہمیشہ کے لئے یہاں سے چلے گئے تھے اور اب یہاں گاؤں کے نام پر بے آب وگیاہ ایک چٹیل میدان پڑا تھا اور لوگ باگ یہاں سے ہجرت کر کر کے جنگل میں جا بسے تھے۔
بابا رمضان روزانہ صبح صبح یہاں آجاتا اور شام ہوتے ہوتے اپنے گھر واپس پہنچ جاتا۔ گھر اس کا کیا تھا، جھونپڑیاں جو جا بجا لوگوں نے ڈال لی تھیں ایک ایسی ہی جھونپڑی میں وہ بھی پڑا رہتا تھا۔ آس پاس کی بستیوں میں محنت مزدوری کے لئے جو لوگ چلے جاتے تھے وہ بھی شام ہوتے ہی لوٹ آتے تھے اور یوں مگن ہو جاتے جیسے وہ برسوں سے یہیں رہتے آرہے ہیں اور ہمیشہ ان کو اسی جگہ رہنا ہے۔
سب سے بڑا مسئلہ ان کسانوں کا تھا جو نئی بستی میں کھیت نہ ہونے کے سبب کاشتکاری سے محروم تھے نہ فصل پر انہیں غلہ نصیب ہوتا تھا اور نہ تو تہوار کے موقع پر سچی خوشی میسر آتی تھی۔ جانے کتنی رتیں دبے پاؤں آئیں اور چلی گئیں مگر کسانوں کو شہروں سے مزدوری کرنے ہی سے نجات نہ ملی۔ بابا رمضان یہ سب کچھ دیکھ دیکھ کر کڑھتا تھا لیکن آسیب کا خوف کچھ ایسا سوار تھا کہ کسی طرح دل سے نہ نکلتا تھا کتنی بار یہ ہوا کہ جمعہ کی نماز کے بعد اس نے لوگوں کے سامنے ہاتھ جوڑ جوڑ کر کہا کہ اپنے پرکھوں کی زمین کو پھر سے آباد کرو۔ لیکن لوگ اسے دیوانہ سمجھتے، سودائی خیال کرتے، اس پر ہنستے، آوازے کستے جب کوئی تہوار کا موقع آیا اس نے لوگوں کو پرانی بستی کی طرف توجہ دلائی کہ وہاں لوگ کس قدر سیر چشمی فراغت اور دلجمعی سے تہوار مناتے تھے، لوگ صرف ٹھنڈی آہیں بھر بھر کر رہ گئے سب تو سب سرکار کے کچھ آدمیوں نے آ کر لوگوں کو پرانی بستی بسانے پر آمادہ کیا لیکن لوگ مطلق آمادہ نہ ہوئے۔
بابا رمضان اس کچی سڑک کے موڑ پر کٹے ہوئے درخت کے ایک تنے پر سر

نیموڑ اسے چپ چاپ بیٹھا تھا، معاً اس کی نگاہ کٹے ہوئے تنے کے ایک گوشے پر پڑی جہاں چھوٹی سی ایک کونپل پھوٹ رہی تھی چند روز قبل جو بارش ہوئی تھی یہ سارا اسی کا کرشمہ تھا لیکن اتنی سی بات نے بابا رمضان پہ جانے کیا جادو کر دیا کہ وہ ایکدم سے اٹھ بیٹھا اس کی مٹھیاں بھنچ گئیں اور خلاف معمول تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا وہ نئی بستی میں آیا نئی بستی کے کسی باشندے نے عرصے سے بابا رمضان کو اس قدر خوش اور مطمئن نہیں دیکھا تھا اور نہ کبھی پرانی بستی سے اسے اسقدر سویرے سویرے لوٹتے دیکھا تھا سارے لوگ حیران تھے۔ کھیلتے ہوئے بچے کام کرتی ہوئی عورتیں سب کے سب اسے پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے جیسے کوئی انہونی بات ہوگئی ہو بابا رمضان جھونپڑی میں داخل ہوا تو اس کی بہو جو بھر بھر ہاتھ چوڑیاں پہنے کام کر رہی تھی اور جس کے مترنم چھناکوں سے جھونپڑی میں ایک طرح کی موسیقی سی گونج رہی تھی سکتے میں آگئی، چوڑیوں کے غنائیت آمیز چھناکے ختم ہو گئے خود بابا رمضان کی بوڑھی بیوی جو اپنی پوتی کے جوئیں دیکھ رہی تھی بابا رمضان کو دیکھتی ہی رہ گئی، لیکن بابا رمضان نے کسی پر توجہ نہ دی، کچھ سامان اٹھایا اور جھونپڑی سے نکل یہ جا، وہ جا۔

دو روز تک کسی نے بابا رمضان کو نہیں دیکھا، تیسرے دن وہ لدا پھندا آیا تو اسکے سر پر بورا رکھا ہوا تھا، پھاوڑا اور دوسرا سامان اٹھا کر وہ پرانی بستی میں پہنچ گیا اور رات گئے تک وہ واپس نہیں ہوا، کافی رات میں لوٹا تو صبح صبح پھر چلدیا۔ اس طرح لگاتار کئی دن لگ گئے کہ بابا رمضان کو کسی اور کام کی سُدھ نہ رہی صبح صبح اٹھتا اور پرانی بستی کو نکل جاتا، رات گئے چور چور ہو کر آتا اور پڑ رہتا۔ چند روز لگاتار بارش ہوگئی، بارش کے بعد اب جو پرانی بستی سے بابا رمضان لوٹا تو خوب زور زور سے چیخ چیخ کر گاتا ہوا اور ناچتا ہوا اور ہر ایک سے مخاطب ہو ہو کر یہ کہتا کہ چلو اپنی پرانی بستی کی بہار دیکھو، کوئی کچھ سمجھا کوئی کچھ، کسی نے محض اسے دیوانے کی بڑ جانا لیکن چند منچلے سچ مچ اس کے ساتھ

وہاں پہنچ ہی گئے۔ اب جو دیکھتے ہیں تو تمام سڑک کے کنارے دو رویہ پودے اگے ہوئے ہیں اور بابا رمضان ہر پودے کے گرد جا جا کر ناچتا ہے، اچھلتا ہے اور خوب کودتا پھاندتا ہے ہر نوجوان نے ایک دوسرے کو معنی خیز انداز میں دیکھا پھر ان میں سے ایک نوجوان آگے بڑھا اور نہایت ادب و تعظیم سے بابا رمضان کے سامنے سر جھکا کر کھڑا ہو گیا، دوسرے ہی لمحے تمام نوجوان بھنگڑا ڈال کر ناچنے لگے۔

جزاک اللہ

مولوی حشمت علی کے خطبے کی دھاک تو دور دور کے گاؤں پر بھی کچھ ایسی بیٹھی ہوئی تھی کہ جمعہ کے روز مسجد میں تل دھرنے کو جگہ نہ ملتی تھی لوگ سرور میں وجد کرتے اور درود و سلام کا ورد کرتے جاتے اور حشمت علی کے ہاتھ بار بار چومتے جاتے تھے لیکن آج جو جمعہ کی نماز کے لئے مولوی حشمت علی نے صفوں پر نگاہ ڈالی تو گنتی کے چند مسلمان نظر آئے، قحط نے گاؤں کے گاؤں چٹ کر دیئے تھے حشمت علی کی آنکھوں میں آنسو آگئے جیسے تیسے جمعہ سے فراغت کے بعد اجڑے ہوئے گاؤں پر جو رفتہ رفتہ خالی ہوتا جا رہا تھا ایک اچٹتی نگاہ ڈالتا ہوا وہ اپنے گھر پہنچا جہاں بیوی کو مٹھی بھر چاولوں کی فکر میں غلطاں و پیچاں دیکھا۔ بیٹی نے آگے بڑھ کر ٹوپی اور رومال باپ سے لے کر احتیاط سے کھونٹی پر ٹانگے اور بغیر چینی اور نمک کے چائے کا پیالہ باپ کے پاس لاکر رکھ دیا ابھی چند چسکیاں بھی حشمت علی نے نہیں لی تھیں کہ نوجوان بیٹا حرمت علی گھر میں داخل ہوا اور یہ خبر لایا کہ اس کے پاس کے گاؤں خالی ہو گئے لوگوں نے اپنے مویشی تک ذبح کر ڈالے بہت سے لوگوں نے اپنے بیٹے بیٹیوں کو بیچ کر پیٹ کی آگ بجھائی کچھ لوگ گھاس کھا کھا کر گزارہ کر رہے ہیں شہر کی طرف جو قافلہ جاتا ہے وہ شہر پہنچ کر آدھا رہ جاتا ہے، آدھے بھوک سے ہلاک ہو جاتے ہر شہر کا حال گاؤں سے بدتر ہے پھر بھی سرکار کبھی کبھار مٹھی مٹھی بھر چاول تقسیم کر دیتی ہے لوگ کسی نہ کسی جان بچانے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں۔

حشمت علی نے کبھی خواب میں بھی یہ نہ سوچا تھا کہ ایسے بڑے دن بھی دیکھنے پڑینگے اس کی روٹی توچرب زبانی پر چلتی تھی۔ لوگ اس کے خطبات پر جس قدر وجد کرتے تھے اسی قدر اس کی جیب بھی گرم ہو جاتی تھی اب در و دیوار کو وہ کیا خطبات سنائے اور کیا طلاقت لسانی سے کام لیکر ان بے جان اور بے حس چیزوں کو وجد میں لائے ان سے بھلا کیا اسے روٹی مل سکتی تھی مولوی حشمت علی آبدیدہ ہو گیا وہ جسقدر سوچتا کہ کل کیا ہوگا اس کا دماغ ماؤف ہونے لگتا ہر چند کہ ہر ہر لمحے اس کی زبان پر" اللہ رازق ہے" کا کلمہ کہتا رہتا لیکن وہ دیکھ رہا تھا کہ اس رازق حقیقی نے جو کچھ زمین پر نعمتیں اتاریں انسان ان پر قبضہ جمائے بیٹھا ہے اور جس طرح پاپی کی دولت پر ناریاہ چکی باندھ کر بیٹھتا ہے کچھ اس طرح کال پڑتے زمانے میں بھی رزق پر کچھ پہریدار بیٹھے ہوئے تھے اور ضرورت مندوں بھوکوں کا رزق روکے ہوئے تھے نوجوان بیٹا جو کبھی اپنے عزم راسخ سے پہاڑ کو راستے سے دھکیل دینے کی ہمت رکھتا تھا اور کنکروں پتھروں سے بھی پانی نچوڑنے کا حوصلہ رکھتا تھا سر نیہوڑائے زمین پر اکڑوں بیٹھا تنکے سے مٹی کریدتے ہوئے بولا۔ ابا اب تو یہاں سے نکلنا پڑے گا۔ پورا گاؤں خالی ہو گیا بیوی نے باورچی خانے کے سارے برتن بھانڈے جھاڑ پونچھ کر جمعرات کو چاول پکائے تھے اعلان کیا۔ "آج گھر میں فاقہ ہے" بیٹی جو کھمبے سے لگی کوڑی دور خلاؤں میں گھور رہی تھی اندوہ زدگی میں بولی "پڑوسن بھی گھر خالی کر گئی۔ جمعرات کی فاتحہ کا سہارا بھی گیا"

مولوی حشمت علی ممکن ہے کوئی دوسرا وقت ہوتا تو ہنکارتا کہ " ناشکرو اللہ کی رحمت سے مایوس ہوتے ہو۔ وہ بڑا مسبب الاسباب ہے انشاء اللہ وہ ضرور کچھ نہ کچھ سبیل نکالے گا" لیکن وہ دیکھ رہا تھا کہ معاملہ خاصا گھمبیر ہے اب پانی سر سے اونچا ہوا چاہتا ہے ذرا بھی اس نے جنبش کی اور آل اولاد ہاتھ سے گئی۔ سب سے

بڑھ کر یہ کہ بیوی کی تیوری بھی چڑھی ہوئی تھی سب کے سب اس سے لڑنے اور اسے زیر کرنے پہ تلے ہوئے تھے لہٰذا حشمت علی نے چپکے سے مری ہوئی آواز میں کہا اچھا جو اللہ کی مرضی۔ اگر ہجرت کی ضرورت ہے تو ہجرت ہی سہی مرضی مولا ہمہ اولیٰ"

اتنی بات سن کر اس کے اہل دعیال کی جان میں جان میں آئی۔ اور انہوں نے سکھ کا سانس لیا۔

شہر پہنچ کر بھوکوں کے کیمپ میں مولوی حشمت علی نے مع اہل دعیال ڈیرے ڈال دیئے دیکھا تو عجیب نفسا نفسی کا عالم تھا۔ آل اولاد بہن بھائی ماں باپ کے مقدس رشتے ہیچ تھے ہر شخص کو اپنے اپنے پیٹ کی فکر پڑی تھی اس پہ طرہ یہ کہ کیمپ کی بد نظمی، منتظمین کی بے ایمانیاں اور اقربا نوازیاں جاری تھیں۔ ایک روز کیمپ میں کسی غیر ملک کا مشنری آیا اور لگا لوگوں میں تبلیغ کرنے اس کی تبلیغ کا طریقہ بھی عجیب تھا کہ وہ دودھ کی تھیلیاں اور خشک غذا کے لفافے دیتا جاتا تھا اور تبلیغ کرتا جاتا تھا مع مولوی حشمت علی کے پاس بھی وہ بوڑھا مشنری آن پہنچا اور لگا وعظ دینے پھر تو مولوی حشمت علی سے نہ رہا گیا اور اب جو اس سے مناظرہ کیا تو سارے لوگ ششدر مگر عجب یہ ہوا کہ مولوی حشمت علی کی نہ تعریف کسی نے کی نہ داد دی بلکہ الٹے مشنری کی خوشامد میں لگ گئے چار نوجوانوں نے حشمت علی کو دبی زبان سے برا بھلا بھی کہہ دیا۔

کیمپ میں مٹھی بھر چاول اور چمچہ بھر دال فی کس راشن بندی کی گئی تھی حشمت علی جیسے تن و توش کے آدمی کا اتنی سی غذا پہ کیسے اور کب تک گذارہ ہوتا اتنی سی غذا تو اونٹ کے منہ میں زیرہ کے مصداق تھی پیٹ کی آگ اور بھی بھڑک اٹھتی مشنری جب کبھی آتا مولوی حشمت علی کو اپنی طرف سے خشک راشن ضرور دینا چاہتا لیکن ہمیشہ اس کے منہ پہ سارا راشن پھینک دیتا اور مشنری مسکراتا ہوا چلا جاتا۔

حشمت علی کو سب سے زیادہ حیرت یہ تھی کہ خود اس کی قوم کے لوگ اس کی طرف

مطلقاً توجہ نہیں دے رہے تھے کسی کو اتنی بھی توفیق نہیں ہوتی تھی کہ چھوٹوں کو اگر یہی پوچھتا کہ میاں کس حال میں ہو اور تم پر کیا گزرتی ہے نماز کے اوقات میں شروع شروع میں تو چند لوگ آئے رفتہ رفتہ وہ بھی کہیں غائب ہو گئے اس پر مستزاد یہ کہ کیمپ میں دن میں کئی کئی بار اموات ہو جائیں لوگ بری طرح پیچھے رہے تھے کبھی تو ایک ساتھ بارہ بارہ پندرہ پندرہ کی نماز جنازہ پڑھانا پڑتی ایک بار تو نماز جنازہ پڑھاتے پڑھاتے حشمت علی گر پڑا کسی نے زیادہ توجہ نہ دی صرف ایک شخص نے وضو کا پانی لے کر منہ پر چھڑک دیا دو چار آدمیوں نے ہاتھ پکڑ کر پھر نماز کے لیے اٹھا کر کھڑا کر دیا۔

اگر معمول کے ایام ہوتے اور اس قدر اہم کیمپ میں حشمت علی کو چند روز گزارنے کا موقع ملا ہوتا تو وہ جادو بیانی سے نہ جانے کتنوں کو رام کر چکا ہوتا اور کتنوں سے اپنی سحر بیانی کا کلمہ پڑھوا چکا ہوتا مگر افسوس کہ یہاں تو قیامت برپا تھی دن رات ایک ہنگامہ رہتا تھا چوبیس گھنٹوں میں کل ایک بار جو رزق ملتا تھا وہ تو بقدرِ رمق بھی نہ تھا لیکن پھر بھی اسی کیمپ میں اگر ایک طرف بھوک سے لوگ چیختے جا رہے تھے تو دوسری طرف کچھ لوگ مطمئن بھی نظر آ رہے تھے مشنری کی امداد بھی گاہے گاہے آتی تھی روز روز نہیں پہنچتی تھی پھر بھی کیمپ کے کچھ طبقوں میں پر اسرار چہل پہل جاری تھی اور زندگی سے بھرپور اور پر رونق چہرے نامعلوم کدھر سے آ جاتے تھے کتنی ہی بار حشمت علی نے دیکھا کہ رات کے سناٹے میں کچھ گاڑیاں خاموشی سے آئی ہیں اور خاموشی سے کچھ سواریاں لے کر چلی جاتی ہیں اور دوسرے دن کچھ چہروں پر رونق آ جاتی ہے۔

اس افراتفری میں ایک روز حشمت علی کو اطلاع دی گئی کہ اس کا عزیز از جان بیٹا حرمت علی مشنری کے دام تزویر میں آ کر کیمپ چھوڑ گیا ہر چند کہ حشمت علی نے اعلان کیا کہ اس نے اسے عاق کیا لیکن عجیب بات ہے لوگوں کو اتنی بھی فرصت نہیں تھی۔ کہ اس اعلان پہ کان دھرتے اور تو اور خود اس کی بیوی اور بیٹی پر بھی کوئی ردعمل ظاہر

نہیں ہوا۔

ایک روز نمازِ عشاء کے بعد جو حشمت علی نے اپنے خیمہ میں قدم رکھا تو بھاپ نکلتی ہوئی گرما گرم چائے اس کی بیوی نے پیش کی ساتھ ہی کچھ خشک میوہ بھی دیا جسے دیکھ کر وہ حیران ہوا حرمت کی ماں یہ کیا معجزہ ہوا۔

اور حرمت کی ماں نے بتایا کہ کیمپ میں ایک امیرزادی روزانہ آکر کچھ میوہ چینی دودھ دے جاتی ہے اور اگر کچھ عورتوں کو اپنے ہمراہ لے جاتی ہے تو انہیں پیٹ بھر کھانا کھلاتی ہے دو جوڑے کپڑے کے دیتی ہے چند روز کا راشن ساتھ کر کے رخصت کر دیتی ہے گرما گرم چائے کی چسکی لیتے ہی مولوی حشمت کی زبان سے بے ساختہ "جزاک اللہ فی الدارین خیرہ" کے الفاظ نکلے تو اس کی بیوی نے ملتجیانہ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا "اگر تم اجازت دو تو کسی دن میں بھی کچھ روز کا راشن لے آؤں مٹھی بھر چاول اور چمچہ بھر دال پر کب تک گزارہ ہوگا"

مولوی حشمت علی نے ادھر ادھر دیکھ کر خوب اطمینان کر لیا تو چپکے سے سرگوشی کی اگر کسی کو خبر ہو گئی کہ تم حشمت علی کی بیوی ہو تو ۔۔۔!!

بیوی نے کہا! "یہ میرا ذمہ جو کسی کو کانوں کان خبر ہو۔"

مولوی حشمت علی نے کہا ۔۔ "مگر بھئی یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ جو خاتون اسقدر فیاض ہے وہ دو چار عورتوں کو کھانا کھلانے پہ اکتفا کیوں کرتی ہے لنگر کیوں نہیں کھول دیتی ۔" بیوی نے کہا "تم کو خبر ہے کیمپ میں ہزاروں آدمی ہیں یہاں تو لاکھوں بھی ہوں تو تھوڑے ہیں ۔۔ پھر شوہر کے قریب پہنچ کر رازدارانہ انداز میں بولی " دو جوڑے کپڑے کے کم نہیں ہوتے اس کال میں پیٹ بھرنے کی سدھ میں تن ڈھانپنے کا دھیان کسے ہے جوان جہان لڑکی کا ساتھ ہو ۔ جوان جسم ننگا کھلا اچھا نہیں لگتا ۔" حشمت علی نے کہا: "ٹھیک ہے تم کسی روز چلی جانا ، دو چار دن اچھے گزر جائیں گے۔"

حشمت علی کی بیوی دو عدد ساڑھیاں دو چار روز کا راشن اور کچھ روزگار نے کے لئے چند سکے بھی ساتھ لائی اور مزہ یہ کہ کسی کو کانوں کان خبر بھی نہیں ہوئی لیکن حشمت علی نے دیکھا کہ جانے سے پہلے جو اس کے چہرے پہ چہل پہل اور رونق تھی وہ غائب ہو گئی۔ فقر و فاقہ میں بھی اس کے چہرے پر ایک روشنی سی تھی واپس آئی تو وہ روشنی بجھی ہوئی تھی۔

چند روز کے بعد جب راشن پانی ختم ہو گیا تو حشمت علی نے رازدارانہ لہجے میں کہا "نیک بخت اب کسی روز پھر چلی جانا، پیٹ بھی بھر جائے گا اور تن بھی ڈھک جائے گا۔"
بیوی نے کہا ان دنوں میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"
حشمت علی نے کہا "جب تمہاری طبیعت ٹھیک ہو تم چلی جانا۔ کیوں نہ لڑکی کو بھیج دو۔"

لڑکی جو ساری باتیں سن رہی تھی بولی "ہاں ہاں ٹھیک ہے میں چلی جاؤں گی آخر کتنی لڑکیاں روز جاتی ہیں۔ پھر کچھ کام بھی تو نہیں۔ بیچاری بیوہ عورت ہے سب کو کھلا پلا کر کپڑے ... اور راشن دیکر رخصت کر دیتی ہے۔ ابا میں ضرور جاؤں گی۔"
حشمت علی نے کہا۔ ٹھیک ہے تم چلی جانا۔ ایسی ہی نیک بیبیوں کے دم قدم سے زمین اور آسمان قائم ہیں کہ دوسروں کی خدمت فی سبیل اللہ کر رہی ہیں جزاک اللہ فی الدارین خیرہ۔"

حشمت علی کی بیوی نے کہا۔ کان کھول کر سن لو رقیہ وہاں نہیں جائے گی۔"
"کیوں؟ حشمت علی نے پوچھا
"بس یہ میرا فیصلہ ہے، آخری فیصلہ۔ سمجھے۔"
"تو پھر کام کیسے چلے گا اماں" رقیہ نے سوال کیا
"جیسے اب چل رہا ہے" پھر اس نے دوسرے ہی لمحہ کہا۔

خیرات سمیٹتے ہوئے شرم نہیں آتی تم دونوں کو۔ خبردار جو کسی نے جانے کا نام لیا،، اور پاؤں ٹپکتی ہوئی خیمہ کے باہر چلی گئی۔

باپ نے بیٹی اور بیٹی نے باپ کو استفہامیہ انداز میں دیکھا اور چپکے ہو رہے بیٹی نے سرگوشی کے انداز میں کہا " ابا میں کسی دن چپکے سے چلی جاؤں گی ماں کو خبر بھی نہیں ہوگی،،

حشمت علی نے پیار سے بیٹی کا شانہ تھپتھپایا اور بیوی کو منانے خیمہ کے باہر چلا گیا

ایک روز نماز فجر کے بعد جو مولوی حشمت علی واپس اپنے خیمے میں پہنچا تو دیکھا اس کی بیوی زار و قطار رو رہی ہے۔ حشمت علی نے رونے کی وجہ پوچھی تو اس نے رقیہ کے خالی بستر کی طرف اشارہ کیا گو حشمت علی کو رقیہ کے جانے کا حال معلوم تھا۔ لیکن تردد یہ تھا کہ اسے رات ہی رات واپس آجانا چاہیئے تھا۔ آخر اتنی دیر اسے کیوں ہوئی۔ اب تو دن کی روشنی بھی پھیلتی جا رہی تھی بیوی بدستور تل دھار اوپر دھار رو رہی تھی اور رقیہ غائب تھی صورت حال ابھی واضح نہیں ہو سکی تھی کہ ایک بڑی سی گاڑی کیمپ کے سامنے آکر رکی رقیہ نہایت شاندار لباس پہنے برآمد ہوئی پیچھے پیچھے ایک ملازم کچھ سامان لے کر آیا سامان خیمہ میں رکھوا کر رقیہ نے ماں کے آنسوؤں کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے باپ کی طرف دیکھ کر کہا ابا مجھے مستقل نوکری مل گئی ہے۔ یہ راشن اور کپڑے لے کر آپ لوگ گاؤں واپس چلے جائیں۔ وہاں آپ کو کپڑے اور راشن پہنچا دیا جایا کرے گا۔ اور۔ اور یہ کہہ کر اس نے جھکتے ہوئے پرس سے سو سو کے کئی نوٹ نکال کر باپ کے ہاتھ میں تھما دیئے" کچھ دنوں کے لئے یہ رقم کافی ہوگی،،

باپ نے داڑھی پر ہاتھ پھیر کر" جزاک اللہ فی الدارین خیرہ۔ بیٹی اپنی بی بی کو میرا سلام کہنا اور کہنا کہ مولوی حشمت علی تمہیں جنت کی بشارت دیتا ہے کہ ایسی نیک بخت

بیبیوں سے زمین آسمان قائم ہیں۔"

لیکن حشمت علی کی بیوی کو معاً ہسٹریا کا سا دورہ پڑا اس نے جھپٹ کر نوٹ لے کر اچھال دیئے راشن کو پیروں تلے روندنا شروع کر دیا اور پھر دوڑ کر رقیہ کے بنے سنورے بال نوچ ڈالے اور خیمے کے ستون سے لگ کر زار و قطار رونے لگی، حشمت علی نے جھک کر نوٹ بٹورے بیٹی کے سر پہ ہاتھ پھیرا اور اسے خیمے کے دروازے تک پہنچایا بیٹی نے رخصت ہونے سے پہلے ایک نظر ماں کو دیکھا اور پھر باپ کے کندھے پہ سر رکھ کر یوں روئی جیسے سچ مچ وہ رخصت ہو کر شوہر کے گھر جا رہی ہو، نوکر نے کار کا دروازہ کھولا، رقیہ گاڑی میں جا بیٹھی اور دیکھتے دیکھتے گاڑی ہوا ہو گئی۔ حشمت علی نے آنسو خشک کرتے ہوئے بیوی سے کہا "اٹھ نیک بخت اپنے گاؤں چلیں ہماری تو گھر بیٹھے مراد بر آئی ہے"

گیوُمی اے بی

یہ میرا نیا پڑوس تھا، اور نیا مکان۔

گو ہم مکانوں کی قلت کے دور سے گزر گئے ہیں پھر بھی ملک کے شہر شہر گھوم کر دیکھئے نت نئے مکانات اُگ رہے ہیں بستیاں لہلہاتی ہوئی کھیتیوں کے مانند زمین سے پھوٹ رہی ہیں، فاصلے بڑھتے جا رہے ہیں کاریں اور موٹر سائیکلیں برساتی مینڈکوں کی طرح زمین سے ابل رہی ہیں کیونکہ یہ صنعتی دور ہے اور صنعتیں اس تیزی سے وبا کی طرح پھوٹ پڑی ہیں کہ زراعت بھی صنعت بنتی جا رہی ہے ایک سال پہلے جہاں سیج پچ کے کھیت اور کشت زار نظر آتے تھے اب وہاں کالونیاں سر بفلک بلڈنگیں اور فلیٹس زمین میں پنجے گاڑے ہوئے ہیں بس ایک ایسی ہی بستی کا یہ نیا مکان تھا، اور نیا پڑوس۔

پڑوس سے آپ کو کہیں پرانے محلوں پرانی بستیوں کے پڑوس کا تصور نہ بندھے کہ دیوار سے دیوار جڑی ہوئی، کھڑکیاں دیواروں میں کھلی ہوئی یا چھتے دو مکانوں کو جوڑے ہوئے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے سالہا سال سے ساتھ نباہتے چلے آ رہے ہیں اور مکانوں کی طرح مکین بھی دلوں کے رشتوں میں بندھے ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک، بدن میں دوڑتی ہوئی رگوں میں گردش کرنے والے خون کی طرح گھوم پھر کر ایک ہی مرکز پہ لوٹ لوٹ کر آ جاتے ہیں اور وہ مرکز ہے دل ۔ ان بستیوں میں نہ کھڑکیاں ہیں نہ چھتے اور نہ پڑوسیوں میں کوئی ناتہ ہے نہ رشتہ، یہ مکان اور یہ مکین سب کے سب

مشینوں کی طرح بے جان، بے حس، صنعتی معاشرے کے پرزے ہیں جو اقتصادی تحریک پر گردش کرتے ہیں اور تحریک میں ذرا بھی تعطل پیدا ہوئے تو خود بھی معطل ہو جاتے ہیں۔

میں اس مکان میں آلبا یا یوں کہیئے کہ میری روٹی نے اس جگہ کھینچ کر لا باندھا اور میں بندھ گیا اس مکان سے میرا کوئی آبائی رشتہ نہیں ہے، میرا کوئی ثقافتی رشتہ بھی نہیں ہے کہنے کو تو یہ مکان ہے لیکن سچ پوچھیے تو مکانوں والی کوئی بات بھی اس میں موجود نہیں ہے نہ مٹی نہ درخت نہ کوٹھا نہ چوبارہ نہ باغ نہ چمن، بس سیمنٹ کی چار دیواری ہے نیچے فرش اوپر چھت یا چھت سے لٹکتا پنکھا پہلو میں غسلخانہ، سنگ مرمر کا ٹھنڈا بے مروت فرش سپید شینکس نکل شدہ چمچاتی ٹونٹیاں، شیشے، کنگھے، شیونگ کا سامان شیمپو اور کاسمٹیکس، گویا صنعت، صنعت اور صرف صنعت اور اس کے درمیان ایک جسد خاکی - خاکی - ! سچ مچ خاکی! مجھے شبہ ہوتا کہ شاید میں بھی کسی فیکٹری سے ڈھلا ڈھلایا نکلا ہوا کوئی پرزہ ہوں اور اس مکان میں (اگر یہ واقعی مکان ہے) کہیں نہ کہیں پرفٹ ہو گیا ہوں۔

تو یہ میرا نیا پڑوس — یہ بھی ایک ایسا ہی فلیٹ ہے فرق یہ ہے کہ ادھر جو مکین ہے وہ کوئی مرد نہیں، لڑکی ہے اس کی جنس نے مجھے اکثر چونکایا ہے اور شاید اسی طرح میری جنس نے بھی اس کو چونکایا ہوگا اس کے علاوہ اور کوئی رشتہ ہمارے مابین نہیں ہے وہ اپنے حالات میں مگن ہے یا مجبوراً حالات کے ہاتھوں کھلونا بنی ہوئی ہے اور میں ادھر اقتصادی ڈور سے بندھا ہوا اپنے مختصر سے فلیٹ میں گزارہ کر رہا ہوں وہ ادھر تنہا ہے میں ادھر تنہا ہوں ہم نے تنہائی میں اکثر اپنی تنہائی پہ کافی سوچا ہے اور ایک دوسرے کی تنہائی کے بارے میں بھی چوری چوری خوب سوچا ہے ہماری سوچوں نے تنہائیوں کے حصار میں نقبیں لگائی ہیں اور پھر چپکے ہی چپکے ان دیواروں کے سوراخ بھر دیئے ہیں کیونکہ ہمارا اقتصادی ڈھانچہ مکڑی کے جالے سے بھی زیادہ نازک ہے ذراسی پھونک کی جنبش سے بھی ٹوٹ پھوٹ سکتا ہے۔

وہ کہاں ملازم ہے، مجھے خبر نہیں، میں کیا کام کرتا ہوں اسے علم نہیں، وہ کون ہے،
کہاں سے آئی ہے، یہاں کب سے رہتی ہے، کب تک رہے گی مجھے معلوم نہیں بلکہ ان
میں سے بعض باتوں کا اسے بھی علم نہیں کہ میں کون ہوں کیا ہوں اور یہاں کب تک رہوں
گا ہمیں کیوں معلوم نہیں شاید ہم دونوں کے پاس ان باتوں کے جاننے کے لئے وقت
نہیں اور اگر وقت نکال بھی لیا جائے تو شاید مناسب نہیں کیونکہ ہم جس معاشرے
میں سانس لیتے ہیں وہاں کسی بات پہ اعتبار نہیں اپنے سائے تک پہ شبہ کیا جاتا ہے
اور ہم اپنے سائے تک سے ڈرتے ہیں ڈرتے نہ ہوتے تو وہ میرے پاس آتی یا میں
اس کے پاس جاتا، ہم باہر والوں سے زیادہ اپنے آپ سے ڈرتے ہیں، اپنے اندر سے
ڈرتے ہیں، ہمارے اندر بیٹھی ہوئی ہماری نیت ہماری کھوٹ ہم کو ڈراتی ہے۔

کبھی ہماری نگاہیں تک چار نہیں ہوتیں، ہم دونوں نظریں چراتے ہیں حالانکہ دونوں
کنکھیوں سے گھورتے ہیں میں اخبار پڑھتے پڑھتے بالکنی میں کھڑا ہو کر، شیو بناتے
ہوئے غسلخانے کی کھڑکی کھول کر اسے کام کاج کرتے ہوئے دیکھ لیتا ہوں وہ بھی
اپنے اپارٹمنٹ میں رہتے ہوئے چھوٹے موٹے کاموں کے مابین مجھے دزدیدہ نظروں
سے دیکھ لیتی ہے اور بس شاید اسی بستی کے تمام لوگوں کے آپس کے رشتے ناتے
میکانکی ہیں ان میں جذبات کی کوئی لہر نہیں کوئی رمق نہیں، دودھ والا، اخبار والا، چائے
والا اور میں، اور ان سب سے ہمارے سب کے احتیاجی رشتے، اللہ اللہ خیر سلا۔

میں نے کبھی کبھی یہ بھی غور کیا ہے کہ صنعتی زندگی کی جو عمارت اونچی اور اونچی
ہوتی چلی جا رہی ہے اس سے ہماری نظریں سمٹتی ہوئی اونچی اور اونچی ہوتی آسمان
تک جا پہنچی ہیں زمین سے ہمارا ناتہ روز بروز ٹوٹ رہا ہے زمین پہ مٹی، خاک دھول،
ذرات، کانیں کھیتیاں، درخت بھی کچھ تو ہوتے ہیں اور ان سے ثقافتیں پھوٹتی ہیں
موسم جنم لیتے ہیں، موسموں کے گیت آبشاروں کی طرح ابلتے ہیں پھر یہی نہیں ہم بھی

تو اسی مٹی سے خمیر کی صورت میں اٹھے ہیں اور اسی میں جا ملیں گے میں یہ نہیں کہتا کہ صنعتی زندگی ایک لعنت ہے۔ صنعت کو پنپنا چاہیئے مگر ہمارا ناتہ زمین سے قائم رہنا چاہیئے کالونیوں اور بستیوں میں رشتہ ہونا چاہیئے خواہ رشتہ گیتوں کا ہو، رقص کا ہو یا فنون لطیفہ کے دوسرے مظاہر کا ہو لیکن ہونا چاہیئے یہ درست ہے کہ ہمارے گاؤں سے پنگھٹ ختم ہو رہے ہیں اور ٹیوب ویل لگتے چلے جا رہے ہیں اور کھیتیاں بھی صنعت بنتی چلی جا رہی ہیں لیکن وہ جو پنگھٹ کے گیت کنواریوں کے دلوں کی دھڑکنیں سناتے تھے کہاں دفن ہو گئے ہیں؟ ان صنعتوں میں اجتماعی زندگی کے شعور کے ساتھ ساتھ اجتماعی جذبات بھی لاؤ ورنہ اس کارگاہ میں ادمی اتنی گھٹن ہو جائے گی کہ سانس لینا دو بھر ہو جائے گا۔

یہ لڑکی اپنے معمولات انجام دیتے دیتے ایک دم تیار ہو کر باہر نکلتی ہے جہاں ایک ویگن آتی ہے اور اسے لے جاتی ہے پھر اسی طرح سے اسی جگہ پر پھینک جاتی ہے۔ میں بھی اسی طرح اپنے معمولات میں جٹا رہتا ہوں کالونیوں میں بچے ہوتے ہیں بچے نہ ہوں تو کالونیاں بانجھ ہو جائیں مگر اس کالونی میں بچے بھی کم ہیں اور جو ہیں وہ صبح تڑکے اسکول چلے جاتے ہیں سہ پہر کو لوٹتے ہیں تو تھکے ماندے، اک ذرا کی ذرا کبھی گلی کوچوں میں کرکٹ کھیل کر تھوڑی سی زندگی کی حرارت پیدا کر دیتے ہیں یا کبھی سائیکلنگ کر کے یا تھوڑا سا غل شور مچا کر ورنہ ادھر سورج مغرب میں جھکا ادھر ٹی وی کی بساط بچھی اور بچے بڑے جوان سب کے سب جٹ گئے رات گئے تک ٹی وی ہے یا مطالعہ۔ صبح تک خدا حافظ

میں بھی نہ چاہتے ہوئے بستر میں پڑے پڑے یا پڑھتا ہوں، ریڈیو سنوں ٹی وی دیکھوں، اخبار پڑھوں چائے پیوں، دوست احباب اوّل تو ہیں نہیں کوئی بھولا بھٹکا آجائے تو اس سے ذرا سی سخن پچی کر لوں میرے پڑوس میں شام پڑتے ہی وہ سناٹا ہوتا ہے کہ الامان والحفیظ!

ایسے ہی ایک دن کی بات ہے کہ میں اپنے کمرے میں پڑا تھا کوئی کتاب کھلی ہوئی

تھی کہ کسی کی چمپیلی آواز نے مجھے مخاطب کیا میں نے نگاہ اٹھائی تو سامنے ایک مرمریں
پیکر جینز اور قمیص میں ملبوس بال کھلے سلگتا ہوا سگریٹ انگلیوں میں دبا ہوا میں ہڑبڑا کر اٹھ
بیٹھا میں نے غیر ملکی ہپیز لڑکیوں کو بہت دیکھا تھا ہپیز لڑکوں کو بھی دیکھا تھا لیکن
پاکستانی ہپیز لڑکیوں کو اس طرح دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا قبل اس کے کہ میں
کچھ کہتا سنتا وہ خود بخود فرش پہ آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی اور میرے شانے پہ مکا
جماتے ہوئے بولی "یار تم تو بادشاہ بنے ہوئے ہو —— لو سگریٹ پیو" قبل اس
کے کہ میں انکار یا اقرار کروں، سگریٹ میرے ہونٹوں میں ٹھونس دیا سلگتے ہوئے
سگریٹ سے سخت بدبو نکل رہی تھی قریب تھا کہ مجھے الٹی ہو جائے مگر لڑکی آنکھیں بند
کر کے اور سر نیہوڑا کر میرے بستر پہ دراز ہو گئی میں نے سگریٹ کو سونگھا، اس میں
یقیناً چرس بھری ہوئی تھی میں نے سگریٹ کو پھینکنے کے لئے ہاتھ بلند ہی کیا تھا
کہ وہ کنکھیوں سے مجھے دیکھ کر مسکرائی اور اشارے سے سگریٹ واپس مانگ لیا
اور اس کے خوب گہرے گہرے کش لگانے لگی میں اس صورت حال سے خاصا
پریشان تھا کہ یہ بلائے بے درماں کہاں سے آن ٹپکی   ابھی میری سراسیمگی کم
نہیں ہوئی تھی کہ اس نے تحکمانہ انداز میں کہا جاؤ گلاس لاؤ"۔

میں ٹھٹھک کر سوچنے لگا کہ یہ کیا ہو رہا ہے اس میں میری ذرا بھی مرضی نہیں ہے
لیکن یہ سب کچھ میرے گھر میں ہو رہا ہے کہ اس نے فہمائشی انداز میں کہا "ہری اپ
یو سلی بوائے"!

اور میں مسمریزم کی کسی خفیہ قوت کے تحت غسلخانے میں گیا اور گلاس اٹھا
لایا، اس نے بستر پہ پڑے پڑے تحکمانہ انداز میں کہا "ایک گلاس اور لاؤ"!

میں نے ڈرتے ڈرتے جواباً کہا "بس یہی ایک ہے اکلوتا گلاس"!

وہ ہنسی اور سگریٹ کو احتیاط سے بجھا کر کان کے پیچھے اڑستے ہوئے بولی

!HURRY UP YOU SILLY BOY'

"سو یو آر آل ایلون ہیر"[1]

میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ وہ اٹھی تھیلے سے پرانڈی نکال لائی اور بے تکلفی سے گلاس میں انڈیلنے لگی "تم مجھ کو جانتے ہو؟" میں نے نفی میں گردن ہلا دی۔

"۔۔۔ اور اگر تم جانتے بھی ہو تو کیا فرق پڑتا ہے۔ جانتے بھی ہو تو نہیں جانتے۔ کوئی نہیں جانتا۔ یہاں کوئی کسی کو نہیں جانتا سب اجنبی ہیں ۔۔۔ لو اسے پی لو اسے پی کر تم خود کو جان لو گے خود کو جان لینا بھی تو کمال ہے۔"

میں نے پھر انکار میں گردن ہلائی۔

"او کم آن یو سلی بوائے، یہ شراب ہے یہ تو کیمیائے سعادت ہے ۔۔۔ رگوں میں دوڑ جائے گی ۔۔۔ لو ۔۔۔" اس نے ایک جرعہ چڑھا لیا اور پھر لپک کر مجھے اپنی گرفت میں لیکر بستر پر بٹھا لیا اور اپنے ہاتھ سے گلاس میرے ہونٹوں کو لگا دیا۔ گڈ بوائے۔

میرے حلق کو کاٹتی ہوئی کوئی شے سینے میں اتر گئی دوسرا جرعہ اس نے خود چڑھایا اور تیسرا مجھے دیا اور اس طرح جب ساری بوتل خالی ہو گئی تو اس کو ٹھوکر مار کر بستر کے نیچے پھینک دیا پھر مجھے کھینچ کر بستر پر لٹا دیا اور پھر بستر سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی مکا تان کر بولی میں تمہاری یہ بتیسی توڑ دوں گی ۔۔۔ تم کیا سمجھتے ہو؟ میں تمہاری نیت سمجھتی ہوں، بدمعاش

میں ہکا بکا اسے دیکھنے لگا کہ یہ اچانک کیا ہوا یا اللہ یہ کوئی نوسرباز تو نہیں مجھے لوٹنے تو نہیں آگئی پھر سوچا میرے پلے ہے ہی کیا ساتھ ہی سوچا کہیں وہ بلیک میل کر کے مجھ سے کچھ اینٹھنا چاہے تو کیا ہوگا، بہرحال ہرچہ باداباد اب تو میری گردن اوکھلی میں پھنسی ہوئی تھی۔ مرتا کیا نہ کرتا میں گھگھیانے لگا۔ "میں میں

"سور کے بچے پہلے بھی کتنی بار تم میری عزت سے کھیلتے رہے ہو۔"

"میں؟ میں؟؟" اب تو میں سچ مچ حیران رہ گیا۔ یا اللہ میں نے اس عورت کو اپنی زندگی میں پہلی بار دیکھا اور یہ اتنی بڑی تہمت مجھ پر دھر رہی ہے۔"

1- SO YOU ARE ALL ALONE HERE

"تم چاہتے ہو کہ میں ننگی ہو کر تمہارے ایک ایک اشارے پہ ناچوں"

"ہرگز نہیں، قطعی نہیں —— میں بوکھلا گیا" دیکھئے دیکھئے —— میں تو ایک شریف آدمی ہوں"

"شریف آدمی! —— بڑا آیا شریف آدمی بن کر مجھے دھوکے سے شراب پلا کر رات بھر میری عزت سے کھیلا اور جب میں ماں بننے لگی تو اس مردود ڈاکٹر سے اپریشن کرا کے مجھے ہمیشہ کے لئے بانجھ بنا دیا —— میں تجھے معاف نہیں کر سکتی —— کبھی نہیں کر سکتی" یہ کہہ کر اس نے پتھر کا گلدان اٹھا لیا اور قریب تھا کہ میرے سر پہ دے مارتی کہ میں نے پھرتی سے اٹھ کر دروازہ کھولا اور باہر سے دروازہ بولٹ کر کے لاک کر دیا

بالکنی میں کھڑے ہو کر میں تمام صورتحال پہ غور کر رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اب کیا کروں کہ میں نے دیکھا میری پڑوسن بھی اپنی بالکنی میں کھڑی میری طرف دیکھ رہی تھی اور اس کے ہونٹ ہل رہے تھے وہ کچھ کہہ رہی تھی لیکن میرے کان اندر کی طرف لگے تھے اندر وہ دروازہ ہلا ہلا کر چیخ رہی تھی چلا رہی تھی اور آخر تھک ہار کر رونے لگی ہچکیوں میں صرف اتنا سنائی دیا" اوہ پلیز گیو می اے بی بی"

پسِ دیوار

لوگوں کا بیان ہے کہ میں بیمار ہوں بستر پہ پڑے پڑے چھت کو تکا کرتا ہوں چھت کی پرانی اور خستہ کڑیوں کو گن کرتا ہوں کڑیوں میں جمے ہوئے پڑوں یا پھٹوں میں رینگتی ہوئی سیلن اور سیلن کے اندر چھپی ہوئی دیمک پہ نظریں گڑوئے رکھتا ہوں مجھے اگر کروٹ بھی بدلنا پڑے تو خود سے نہیں بدل سکتا کوئی نہ کوئی آکر سہارا دیتا ہے تو کروٹ بدلتا ہوں، کروٹ بدلتا ہوں تو رخ بند کواڑ کی کھڑکی کی طرف ہو جاتا ہے جانے کب سے یہ کھڑکی بند ہے نہ ہوا کا کوئی جھونکا آسکتا ہے نہ روشنی کا گذر ہو سکتا ہے، کھڑکی کے چھتے پہ بے شمار جالے تنے ہوئے ہیں ان جالوں میں دوڑتی ہوئی مکڑیوں کو میں جانتا پہچانتا ہوں ان کو اکثر دیکھتا ہوں جالے پورنا اور شکار کی گھات میں چھپ کر بیٹھ جانا ان کی عادت ہے میں ان شکاری مکڑیوں کی نفسیات سے روز بروز آگاہ ہوتا جا رہا ہوں لیکن کبھی کبھار اس بند کواڑ کی کھڑکی سے لگ کر کوئی آکھڑا ہوتا ہے میں پسِ دیوار دیکھ تو نہیں سکتا لیکن آوازیں ضرور سن لیتا ہوں، میں کن سنیاں تو نہیں لیتا لیکن آوازیں جب خود بخود دندناتا میرے کانوں میں گھستی چلی آئیں تو کیا کروں کانوں میں ٹھینٹیاں بھی تو نہیں دے سکتا ان آوازوں کے ذریعہ میں کئی لوگوں سے واقف ہو گیا ہوں مجھے ان کی چھوٹی موٹی بہت سی باتیں معلوم ہیں اور ان باتوں کے اجزا کو جوڑ جوڑ کر کہانیاں میں نے مرتب کی ہیں ان میں غم و الم بھی ہے دکھ سکھ بھی ہے محرومیاں، خود غرضیاں حسد جلن، رشک، شجاعت، بزدلی سب کچھ ہے وہ سب کچھ ہے جو اس سرزمین پہ ازل سے ہوتا آرہا ہے اور جو ابد تک ہوتا رہے گا ان میں کوئی نیا پن نہیں پھر بھی ان میں زندگی کا

خون گردش کر رہا ہے ان میں جذبات کی حرارت اور دلوں کا گداز شامل ہے جس سے میں
روز بروز محروم ہوتا جا رہا ہوں زندگی کے جزی سے جزی واقعہ کو بھی میں تحریص اور تشویق سے
دیکھنے لگا ہوں میں روز بروز کی زندگی سے دور ہوتا جا رہا ہوں موت میری گھات میں کسی مکڑی کی
طرح چھپی بیٹھی ہے اور زندگی کی حرکت پہ اپنا جال پورتی جا رہی ہے زندگی کے اعضا شل اور معطل
ہوتے جا رہے ہیں ... اور لگتا ہے کہ کسی نہ کسی دن موت کی مکڑی مجھے ہڑپ کر
جائے گی۔

کی پھر بھی میں زندہ ہوں، زندہ رہنے کی خواہش میرے اندر موجود ہے جوں جوں
بیماری ناتوانی اور اعصاب میں اضمحلال بڑھ رہا ہے زندگی سے پیار بڑھتا جا رہا ہے حالانکہ
میرے جینے یا مرنے سے بھلا کیا فرق پڑتا ہے ماضی میں لوگ مرتے رہے ہیں تو کیا فرق پڑا
ہے اب بھی نہ جانے صبح صبح بستر سے زندہ سلامت اٹھنے والے کتنے ہی افراد سر شام قبر کی تاریکی میں
جا اترتے ہیں کائنات میں کوئی فرق نہیں ہوتا میں مر جاؤں گا تو کیا فرق پڑے گا لیکن نہیں
میں آخر میں ہوں، میں کیوں مروں، میں مرنا نہیں چاہتا میری بلا سے کوئی مرتا ہے تو مرے
ایک مرے خواہ ہزار مریں میری جوتی کی نوک سے میں زندہ ہوں کیونکہ میں، میں ہوں،
کوئی اور نہیں میرے اندر زندگی کی کوئی جوت جل رہی ہے اور مجھے اکسا رہی ہے کہ میں زندہ
رہوں وہ کوئی معمولی جوت نہیں ہے میں خواہ اسی بستر پہ اسی طرح پڑا ایڑیاں رگڑتا رہوں
لیکن میں یہ کھیل دیکھتا رہوں کہ مکڑیاں جالے پور رہی ہیں اپنے اپنے شکاروں پر جھپٹ
رہی ہیں چھپکلیاں گھنٹوں چھت سے چمٹی شکار پہ نگاہیں جمائے ہوئے ہیں پس دیوار
خواہ کچھ بھی ہو رہا ہو لیکن زندگی کے انفرادی یا اجتماعی واقعات تسلسل کے ساتھ جاری
رہیں میں یہ آوازیں سنتا رہوں، کہانیاں بنتا رہوں اور ان کہانیوں میں کھویا رہوں کیونکہ
ان میں سے ہر ہر کہانی میں میں نہ بھی ہوتے ہوئے میں ہی موجود ہوں یہ ساری جگ بیتیاں
آپ بیتیاں ہیں ان میں سے ہر ہر کہانی میں میں موجود ہوں، دوڑا ہوا پھیلا ہوا، سمایا ہوا ہوں

میں اسی طرح ان میں دوڑا ہوا اور بیپرا ہوا ہونا چاہتا ہوں۔

ایک رات دو سہمے ہوئے سائے اس بند کواڑ کی کھڑکی کے عقب میں آ کھڑے ہو۔ محبت کے عہد و پیمان کرنے لگے وہ دیر تک باتیں کرتے رہے ان کی آہستہ اور لرزتی ہوئی آوازوں میں بلا کا اعتماد تھا، انہوں نے عہد کیا کہ وہ محبت کا ایک ایسا مینار تعمیر کریں گے جو حقیقت میں مینارہ نور ہوگا۔ اور اندھیرے میں روشنی پھیلاتا رہے گا۔

دوسرے دن دو آدمی قہقہے لگا رہے تھے کہ مینار تعمیر کرنے کے لئے اینٹ اور گارا تو ہے نہیں چلے ہیں مینار تعمیر کرنے۔ اس کے بعد یہ کہانی چلتی رہی مینار بنانے کا عزم اور بے سروسامانی کے مابین کھینچا تانی ہوتی رہی، ہوتی رہی، حتیٰ کہ ایک دن دو اشخاص آپس میں یہ گفتگو کرتے ہوئے پائے گئے کہ لو بھئی چلے تھے مینار تعمیر کرنے اور کر لی شادی آپس میں اب مینار کہاں اور کب تعمیر ہوگا اور میں دل ہی دل میں ہنس رہا تھا، کہ اے نادانوں اینٹ اور گارے کے مینار کہاں باقی رہتے ہیں مینار تو دلوں کے اندر تعمیر ہوتے ہیں سو وہ تعمیر کر چکے تم کو نظر نہ آئے تو کوئی کیا کرے میناروں کی روشنی تو بجھ جاتی ہے لیکن مینارہ نور کو کون بجھا سکتا ہے آج نہ جانے کتنی مٹی مٹی سی نشانیاں دھرتی پر موجود ہیں کتنے ٹوٹے ہوئے مینار کتنی عمارتوں کے آثار اور کتنی تہذیبوں کے کھنڈر خاک میں آسودہ ہیں لیکن ایک نظر سے زیادہ ان کی کیا وقعت ہے لیکن جو کہانیاں دلوں میں لکھی ہوئی ہیں رگوں میں بیپری ہوتی ہیں ہمارے جسم و جاں میں دوڑی ہوئی ہیں صدیوں کے امتداد نے بھی انہیں کچھ گزند نہ پہنچائی۔ مینارہ نور تو یہی ہیں۔

میں کروٹ لے سکوں یا نہ لے سکوں میں کچھ دیکھ سکوں یا نہ دیکھ سکوں مگر میرے اندر وہ سب کچھ ہو رہا ہے جو پس دیوار جاری ہے پس دیوار زندگی کا قافلہ چلا جا رہا ہے یہ قافلہ میرے اندر چل رہا ہے پس دیوار گیت گائے جائیں میرے اندر ان کی بازگشت ہوتی ہے، پس دیوار غم و الم کی داستان چھیڑی جائے میرے اندر بھی وہی دکھ اور

درد کی لہریں اٹھتی ہیں کائنات کے ضمیر میں میرا ضمیر ہے میرے ضمیر میں کائنات کا ، ہم لازم وملزوم ہیں ہمارے رشتے اٹوٹ ہیں۔

رات کے گہرے سناٹے کو چیرتی ہوئی پہریدار کی گرجدار آواز آتی ہے ، جاگتے رہو اور اس سرے سے اس سرے تک اس کی گونج سنائی دیتی ہے اس کی لاٹھی کی کھٹا کھٹ دور سے آتی ہوئی قریب اور قریب تر ہوتی جاتی ہے اور دور ہوتی ہوئی کہیں گم ہو جاتی ہے اور میں سوچتا ہوں سونے والے سوئے رہتے ہیں جاگنے والے جاگتے ہیں لیکن سونے اور جاگنے سے کچھ فرق نہیں پڑتا خواہ دونوں آنکھوں کو کھول کر اور دیدے پھاڑ پھاڑ کر جاگتے رہو، رہزنوں اور ڈاکوؤں سے مفر نہیں سارے دھندے جاری رہتے ہیں دن دھاڑے بھی اور رات کے اندھیرے میں بھی کوئی کسی کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا پہریداروں، محافظوں اور جاگنے جگانے والوں کی لاٹھی کی کھٹا کھٹ نہ جاگتے رہو کی آوازیں دینے والوں کی تنبیہیں ایک رات عین اسی بند کواڑ کی کھڑکی کے پاس پہریدار نے کسی دبکے ہوئے سائے پہ ٹارچ کی روشنی پھینک کر کہا۔

"کون ہے تو؟"

"جی - جی میں ؟"

"میں میں کیا لگا رکھی ہے سیدھی طرح جواب دے کون ہے تو"

"جی میں ایک شریف آدمی ہوں"

"شریف آدمی - شریف آدمی راتوں کو اس طرح چھپتے پھرتے ہیں، دکھاؤ اپنا شناختی کارڈ"

"جی وہ شناختی کارڈ تو -"

بس یہ سنتا تھا کہ پہریدار نے لوگوں کو گھروں سے نکال نکال کر اکٹھا کر لیا اور ایک ایک سے پوچھا کوئی اسے جانتا ہو تو بتائے ہر ایک نے کانوں پہ ہاتھ دھرے

کہ حاشا و کلا ہمیں خبر نہیں نہ اس کا ہماری بستی کا سا لباس ہے نہ بول چال نہ وضع قطع یہ ہرگز ہم میں سے نہیں ہے اب تو پہریدار نے گریبان پکڑا کہ بتا جی بتا دو سیدھی طرح کہ کون ہو تو وہ بولا" اب تو مجھے بھی یاد نہیں کہ میں کون ہوں۔ اب تو مدتوں سے میں یہیں بھٹک رہا ہوں البتہ جب میں کہیں سے چلا تھا تو شریف آدمیوں میں میرا شمار ہوتا تھا مجھے اس بستی کے بوڑھے بابا نے بلایا تھا"

پہریدار نے پوچھا۔

"بوڑھا بابا — کون بوڑھا بابا؟"

کسی نے کہا" تھا ایک بوڑھا بابا، اس نے بلایا ولایا نہیں تھا کسی کو یہ خود ہی چلا آیا ہوگا"

اجنبی قسمیں کھاتا رہا کہ اسے بلایا گیا تھا لوگ انکار کرتے رہے۔ کسی طرف سے کوئی اور شخص آ نکلا اور اس نے کہا۔

"ارے یہ تو پاگل ہے"

"پاگل؟"

"ہاں ہاں آج سے کئی سال پہلے اس بستی کے اسٹیشن پہ ایک ٹرین آ کر رکی تھی یہ اس میں سے اترا تھا"

"اچھا"

"جب سے اب تک یونہی گھوم رہا ہے واہی تباہی بکتا پھرتا ہے۔ کبھی کہتا ہے یہ وہ اسٹیشن نہیں ہے میں غلط جگہ آ گیا کبھی کہتا ہے وہ گاڑی کہاں ہے جو مجھے یہاں لائی تھی۔۔۔"

بہت سے لوگوں نے قہقہے لگائے۔

"دماغ میں خلل ہے تو پاگل خانہ میں کیوں نہیں بند کیا"

اجنبی بولا "میں پاگل ہرگز نہیں، تم سب پاگل ہو گئے ہو"

پہریدار بولا اچھا بابا جاؤ۔ اپنا کام کر۔ سب کی نیند کیوں حرام کرتا ہے، جا اپنے گھر میں بیٹھ۔"

کسی نے کہا، "اس کا کوئی گھر ہی نہیں"

وہ بولا "ہاں میرا کوئی گھر نہیں میرا کوئی ٹھکانہ نہیں"

ایک نے کہا "پہلے تو سب نے اس کو اپنے اپنے گھروں میں جگہ دی، پر جب دیکھا کہ دماغ میں خلل ہے تو بھی مجبوراً۔۔۔۔"

پہریدار نے کہا۔ اگر اس سے کوئی خطرہ نہ ہو تو اسے گھومنے پھرنے دیا جائے"

لوگوں نے کہا "اس سے بھلا کیا خطرہ ہیں، گھومنے دو"

لوگ اپنے اپنے گھروں میں جا بیٹھے، پہریدار پہرہ دینے لگا، اجنبی کی پھر آواز نہ آنا تھی نہ آئی۔ شاید اس کی اتنی ہی کہانی تھی، کہانی جو آوازوں کے سہارے شروع ہوئی اور آوازوں پہ تمام ہوئی، پہریدار کی گونجدار آواز اب بھی راتوں کو سنائی دیتی ہے جاگتے رہو اور میں دن رات آوازوں پہ کان لگائے کہانیاں چنتا رہتا ہوں، لکڑیوں کے جالے تنتے جارہے ہیں چھت کی کڑیاں کمزور اور خستہ ہوتی چلی جارہی ہیں اور میرے جسم کے ڈھانچے کی سکت روز بروز کم ہوتی جارہی ہے۔ پھر بھی میرے کان آوازوں پہ لگے رہتے ہیں ابھی ابھی دو تعلیم یافتہ گفتگو کر رہے تھے ایک بولا "یار میں تو چلا جاؤں گا"

"کہاں؟"

"کہیں بھی، مشرق وسطیٰ، یو۔کے، کینیڈا، اسٹیٹس وغیرہ"

"ہاں یار، بے روزگاری تو بڑھتی جارہی ہے"

"دراصل میرا معاملہ روزگار کا نہیں ہے"

"پھر کیا ہے؟"

"یار یہاں، میرا مطلب ہے تم سمجھ گئے نا"

"تمہارا مطلب ہے کہ تمہارے ڈیڈی کو الیکشن کے لئے ٹکٹ نہیں ملا"

ٹکٹ کی کیا بات ہے یار، نہ کوئی لائسنس، نہ بزنس نہ کچھ مال باقی۔ یار دیکھو طارق کے ابا نے جرمنی میں ہوٹل کھول دیا، کہ وہ لاکھوں کما رہے ہیں۔ یہاں تو۔"

"ہاں یہاں تو بس"

"اور پھر دیکھو یار کتنی زیادتی ہے یہ نہ کرو وہ نہ کرو،،

"یار سن،"

"ہاں۔ خوب یاد آیا، جیری کا خط آیا ہے، یار اس کے تو بڑے ٹھاٹھ ہیں، اسٹیٹس میں دن رات عیش ہے،،

"بلیو"

"یار تو ایک بلیو کی بات کرتا ہے، بس نہ پوچھ،،

"کچھ ایسا کرو یار کہ ہم دونوں چلیں، کسی خاص کورس کا چکر چلاؤ اور بس پھر، ہم ہوں اور زندگی کے مزے،،

میں بھلا کیسے کان بند کر لوں آوازیں کیونکہ نہ سنوں آوازیں جو اچھی ہیں جو بڑوی ہیں جو خوش آئند ہیں جو بھدی ہیں آوازیں جو مجھے کہانیاں سناتی ہیں جو میرے کرتوت مجھے دکھاتی ہیں جو میری رہنمائی کرتی ہیں۔ جو مجھے بدراہ کرتی ہیں جو مجھے بہکاتی ہیں ان آوازوں میں کیا کچھ نہیں ہے میں ان آوازوں کی طرف سے اگر کان بند کر لوں تو یقین کیجیے کہ زندہ درگور ہو جاؤں۔

سہرا

الہ دین کی ٹکر کا پورے احاطہ میں ایک بھی تانگہ نہ تھا۔ گھوڑا ابھی چکنا چوڑا کہ نگاہ پھسلتی تھی۔ اس پہ طرّہ یہ کہ خود الہ دین ریشمی لاچہ باندھ کر طرحدار ساکرتا پہنتا اور سر پہ ترچھی پگڑی باندھ کر بڑے ہی ٹھسّے سے آگے بیٹھتا اور اپنی سپید بڑی بڑی مونچھوں پہ ناؤ دینا رہتا اور اپنی چاروں جوان جہان بیٹیوں کو جو گھر کی دیوار پر آدھی آدھی جھکی ہوتیں ایک نگاہ ڈالتا اور مسکراتے ہوئے کہتا خدا حافظ ــــ پھر گھوڑے کی لگام آہستہ سے ہلاتا "چل پُتر ــــ روزی پہ"، گھوڑا بھی اس کے ایک ایک اشارے کو سمجھتا تھا۔ دھیرے سے قدم اٹھاتا اور اپنے مالک کی پندارِ خودی کو پہچان کر اکڑتا ہوا احاطے کے باہر چل پڑتا۔ اسی وقت شیداں کی کھنکتی ہوئی آواز آتی جو ڈھونڈ کر دروازے پہ آتی: "اوے آلہ دین، تجھے یاد ہے سارا کام ــــ یہ چار مٹنڈیاں چھاتی پہ سوار ہیں ایک ایک کو نپٹانا ہے ــــ پہ تیرے کان پہ ذرا جوں رینگے!!" اور الہ دین پیچھے مڑ کر دیکھتا ــــ "نی مجھے سب کچھ یاد ہے تو سمجھتی ہے سارا درد تیرے ہی دل میں سمایا ہوا ہے ــــ میں بھی تو کچھ لگتا ہوں کڑیوں کا ــــ" جا جا اندر بیٹھ سارے جگ میں ڈھنڈھورا پیٹے ہے، جیسے یہ کوئی نئی مال ہے ــــ اور نہ شیداں بکتی جھکتی دروازہ بند کرتی تو الہ دین کا تانگہ احاطہ سے نکل کر سڑک پہ آتا اور تانگوں کے اڈے پہ پہنچ کر الہ دین ہمیشہ حیات کے کھوکھے سے سگریٹ خریدتا اس سے دو چار باتیں کرتا ادھر ادھر بکھرے ہوئے یار احباب کے تانگوں پہ اچٹتی سی نگاہ ڈالتا

ایک آدھ سے صاحب سلامت دو ایک پر فقرے انچھر پھینکتا کوئی سواری اٹھاتا اور یہ جا وہ جا۔

رات گئے لدا پھندا گھر پہنچتا گھوڑے کو دانہ پانی دیکر خود روٹی کھاتا شیداں کو اپنے ساتھ کھلاتا، وہ بکتی جھکتی رہتی لیکن الہ دین ایک ذرا کی ذرا حقہ پیتا اور پھر پلنگ پہ گرتے ہی بھوسہ ہو جاتا۔

ایک رات جو الہ دین گھر لوٹا تو کیا دیکھتا ہے کہ شیداں نے خلاف معمول ہشاش بشاش اس کا خیر مقدم کیا۔ کھانا کھلایا اور مٹھائی لاکر دی اور بتایا کہ بڑی بیٹی ثریا کا رشتہ آگیا ہے اور اگلے چاند کی پانچ تاریخ کو بارات اترے گی۔ لڑکا بھی کوئی غیر نہیں اس کے یار حامد پرچون فروش کا بیٹا ماجد ہے۔ لینے دینے کا بھی جھگڑا نہیں، حامد خود کہہ کر گیا ہے "بھابی ثریا تو اپنی دھی ہے ماجد الہ دین کا بیٹا ہے ـــــ بس گنے چنے عزیز دوست آئیں گے نکاح کر کے لے جائیں گے"، چلو اللہ دے اور بندہ لے۔ الہ دین کو جیسے چھپر پھاڑ کر دولت مل گئی ـــــ حامد کی شرافت ماجد کی سعادت مندی پہ اسے بے اختیار پیار آنے لگا وہ دیر تک حامد کی تعریف کرتا رہا دوسرے دن اس نے مٹھائی خریدی تانگہ کسا اور حامد کے گھر جا پہنچا۔ حامد کو گلے لگا کر اور بھینچ بھینچ کر اس نے مٹھائی کھلائی اور حامد کی بیوی کو مٹھائی کے ڈبے پہ دس روپے کا نوٹ رکھ کر ادب سے پیش کیا۔ خوب ہنسی مذاق ہوتا رہا چلتے وقت ماجد کے سر پہ ہاتھ پھیر کر پچاس روپے اس کو بھی دیئے اور جب حامد نے کہا کہ "یار تو اس طرح قارون کا خزانہ لٹا رہا ہے تو لا پھر میرا حصہ بھی دے"! الہ دین نے جیب سے ایک چونی نکال کر اس کے ہاتھ پہ رکھی کہ "لے بنیئے یہ ہے تیرا حصہ" ـــــ اس سے زیادہ تجھے نہیں ملے گا۔ سارے لوگ ہنسی خوشی باتیں کرتے رہے کہ تھوڑی دیر بعد الہ دین اٹھا اور تانگہ پہ جا بیٹھا اور خدا حافظ کہہ کر رخصت ہوا۔ "کیا شاندار تانگہ ہے"، حامد کی بیوی نے کہا۔

" اور گھوڑا؟" ماجد نے سوال کیا۔

" ارے سب سے زیادہ شاندار تو خود میرا یار ہے الہ دین سچ مچ دل کا بڑا بادشاہ ہے"

شادی کے جب کچھ دن اور قریب رہ گئے تو ماجد کی نانی کی یہ فرمائش الہ دین کے گھر پہنچی کہ پھولوں کے سہرے کے ساتھ ساتھ دولہا کے لیے سنہری مقیش کا سہرا دلہن کے گھر والے ضرور بھیجیں اسی سہرے کو باندھ کر دولہا دلہن کے گھر بارات لے کر آئے گا

الہ دین مسکرایا اور بولا" یہ کتنی بات ہے ہو جائے گی پوری"

دونوں میاں بیوی شادی کی تیاری میں لگ گئے۔ جو کچھ جمع پونجی رکھی سینتی تھی وہ سب نکال کر ثریا کے کپڑے لتے گہنے پاتے میں لگا دی کھانے کا اچھا خاصا انتظام ہوا اور رہیں نہیں کر کے بھی تھوڑا بہت جہیز اکٹھا کر لیا گیا اور جب برات آنے کا وقت ہوا تو الہ دین کے بلائے ہوئے مہمان آنے لگے، بیچارا دوڑ دوڑ کر کام کاج کر رہا تھا سہرا بھیجا جا چکا تھا لیکن برات آنے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔ جب کسی کو دولہا کے گھر دوڑایا گیا کہ جلدی بارات لاؤ تو وہ عورت الٹے پاؤں واپس آئی اور الہ دین کو الگ لے جا کر بولی ماجد کی نانی تو بپھری ہوئی شیرنی کی طرح گرج گرج کر کہہ رہی ہے کہ جب تک اس سہرے میں سو سو کے پچاس نوٹ نہ لگے ہوں نہ سہرا بندھے گا نہ بارات جائے گی۔ چاہے مشرق کا سورج مغرب سے نکل آئے میں بارات نہیں لاؤں گی"

الہ دین بیچارا سناٹے میں آ گیا شیداں پہ جیسے بجلی گر پڑی۔

" سو سو کے پچاس نوٹ، بھلا کتنی ہوئی یہ رقم؟"

کسی نے حساب جوڑ کر کہا" پانچ ہزار پورے پانچ ہزار"

الہ دین تیزی سے تانگہ پہ جا بیٹھا اور تانگہ دوڑتا ہوا یہ جا وہ جا۔ کچھ دیر بعد وہ گھر لوٹا تو کرائے کے رکشے پہ اور شیداں کی جھولی میں نوٹ ڈال کر بولا۔

" لے نیک بخت بھیج دے یہ نوٹ سہرے میں ٹانکنے کے لئے۔

شیداں کھٹک گئی سمتی بولی "تانگہ اور گھوڑا ؟"

" بیچ دیا بھاگوان، نہ بیچتا تو اپنی ثریا کی ڈولی کیسے اٹھتی "

" تو اب ہم کھائیں گے کہاں سے ؟"

" اری شیداں تو کہتی ہے کھائیں گے کہاں سے اور میں کہتا ہوں باقی تین لڑکیوں کا کیا ہوگا ان کی ڈولی کیسے اٹھے گی کھانے کو تو آدمی مزدوری کر کے کھا لیتا ہے اچھا تو یہ رقم تو بھیجو جو بہرے میں مانگی جائے اور بارات آئے" شیداں جھولی کی رقم آنکھوں سے لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی جیسے رقم نہ ہوئی کوئی مقدس تبرک ہوا جو کوئی حاجی خانہ کعبہ سے لے کر آتا ہے۔

ہاتھی کے دانت

حمید اکمہار کی چھوکری کو جو نذیراں نے دیکھا تو دھک سے رہ گئی، کیا ٹوٹ کر جوانی آئی تھی لونڈیا پر، جسم تو پھٹ پڑا تھا، گدرایا ہوا پنڈا، کورا کنوارا سرخ سرخ خون رگ رگ میں دوڑتا ہوا انگ انگ سے پھوٹا پڑتا تھا اور عضو عضو سے ابلا پڑتا تھا تمتمایا ہوا چہرہ سرخ آنکھیں، متحرک نتھنے سارے آثار بتا رہے تھے کہ چھوکری کا رواں رواں جذبات کی تیز آنچ پر سلگ رہا ہے نذیراں کو محسوس ہوا کہ بنا بنایا کھیل تیار ہے ذرا سے اشارے سے ٹوٹے ہوئے پھل کی طرح جھولی میں آن گرے گی اور پھر وارے نیارے کر دے گی

نذیراں نے دروازے پہ پڑا ہوا ٹاٹ کا پردہ سرکا کر آنگن پہ نظر ڈالی تو حمیدا غائب تھا۔

بتوں چارپائی پہ بچھا رہی تھی اس نے نذیراں کو جو آتے دیکھا تو اٹھ کر بیٹھ گئی سلام کیا اور چارپائی پہ بٹھا کر گھڑے سے کچے دہی کی لسی بنا لائی، نذیراں نے ہزاروں دعائیں دیں لسی پی اور جلدی سے چادر سنبھالتی بھاگتی ہوئی اور سانس سنبھالتی ہوئی اپنے گھر میں آن داخل ہوئی، فجا بیٹھا حقہ پی رہا تھا اس کے قریب پہنچ کر رازدرانہ انداز میں بولی:

"خزانہ تو اپنی بغل میں پڑا ہے"

فجے کی آنکھوں میں ایک ذرا تجسس کی چمک پیدا ہوئی۔ گویا اس نے نظروں ہی نظروں میں پوچھا "کہاں" —؟

نذیراں نے ہاتھ کے اشارے سے پڑوس کی طرف اشارہ کیا۔ گویا حمید اکمہار کے گھر کی زمین پھٹی اور سونے کی کان نکل آئی: نذیراں رازدرانہ لہجے میں بولی "تو تو ادھر

اُدھر جھک مارتا رہا۔ اور! فجا ہونٹوں پہ انگلی رکھ کر بولا "کام اتنا آسان نہیں جتنا تو سمجھی ہے"۔

نذیراں آسمان کی طرف اشارہ کر کے بولی "وہ بڑا کارساز ہے۔ سارے کام آسان ہوں گے"۔

"کیسے ہوں گے؟"

"یہ تو میرے اوپر چھوڑ دے ___ اور پھر دیکھ یہ تیری نذیراں کیا کرتی ہے"۔

فجے نے ایک گالی دیکر کہا "حرامزادی تو تو ہے ہی حرافہ .... جانے کتنوں کو جُل دیدی۔ بیسیوں کو بدراہ کر دیا تو نے"۔

نذیراں بے حیائی سے ہنس کر بولی "بیسیوں نہیں بھولے بادشاہ سینکڑوں۔ پر رہی سدا تیری"۔

"اور کون سمیٹتا تجھے۔ بازاری مرد کسی کا نہیں ہوتا: تجھے کون پوچھتا"۔

"خیر.... نذیراں منجی سرکا کر حقہ کی نے فجے سے لے کر کش لگا کر بولی "میری جیسی کس بل کی رنڈی بھی ذرا مشکل سے پیدا ہو گی... یاد نہیں تجھے گھڑوں کے میلے میں پوری رات تک ......"

فجا بے حیائی سے ہنسا اور بولا "ہاں ہاں مانتا ہوں بڑی رستم کی بچی ہے"۔

نذیراں پھر جوش میں آگئی اور بولی "قسم ہے جوانی کی فجے، یہ بتوں بھی کم نہیں ہے۔ بڑے غضب کی نذر دار چھوکری ہے۔ بازار میں بیٹھ جائے تو روپیہ کا مینہ برسے"۔

"پر ہے یہ ٹیڑھی کھیر نذیراں"۔

"تو دیکھے چلا جا ___ کیسے کرتی ہوں چٹکی بجاتے میں یہ کام"۔

نذیراں جوانی میں بڑے کس بل کی رنڈی تھی۔ خوب مال پانی بنایا اور اڑایا... اب بڑھاپے میں فجا اور نذیراں دونوں اس چھوٹے سے گاؤں میں آن بسے تھے۔

اور اپنی سابق زندگی پر پردہ ڈالے ہوئے تھے۔ فجا شہر کا چھٹا ہوا غنڈہ ہوا کرتا تھا۔ لیکن جوانی گزرتے ہی دونوں از کار رفتہ ہو گئے تھے۔ اب گویا دونوں کا جسم جواب دے چکا تھا اور بظاہر تو وہ دونوں اللہ اللہ کر رہے تھے لیکن تھے اسی تاک میں کہ کوئی زوردار لونڈیا مل جائے اور اسے اپنے ڈھرے پہ لگا کر مال پانی بنائیں اور زندگی کے باقی دن بھی کسی قدر آرام سے گزاریں۔

نذیراں نے اپنے ڈھنگ سے سوچنا شروع کیا اور فجا اپنی طرز پہ سوچنے لگا کہ بنوں کو کس طرح سے اس راہ پہ ڈالا جائے کہ وہ پھر خود بخود ان کی جھولی میں آن گرے نت نئی ترکیبیں سوچنے میں دونوں جُت گئے مگر کوئی ڈھنگ کی بات نہ سوجھتی۔ کبھی نذیراں کوئی بات سوچتی تو فجا ٹانگ اڑا دیتا۔ کبھی فجا کوئی راستہ نکالتا تو نذیراں مین میخ نکالتی غرضیکہ اونٹ کسی کل نہ بیٹھتا تھا۔ ویسے بھی گاؤں کے لوگ سیدھے سادے شریف اور اپنے اپنے کام کاج سے غرض رکھنے والے لوگ ہوتے ہیں گاؤں میں کسی کی شادی بیاہ ہے تو سب خوش ہیں کوئی موت ہو گئی تو سب دکھی اور غمگین اپنے اپنے کام کاج اور اپنی اپنی راہ . . . کسانوں کو دیکھو تو کھیت اور کھلیان سے فرصت نہیں مزدور ہیں تو وہ الگ الگ اپنے اپنے دھندے میں لگے ہوئے۔ لونڈیا کو آخر کیونکر اپنی راہ پہ لگایا جائے یہ سوچ سوچ کر دونوں پریشان سے رہتے۔ ویسے آپ نے شیطان کے شیرے والی کہانی سنی ہی ہوگی۔ جس میں کہا گیا ہے کہ ایک بزرگ جو ہر وقت لاحول پڑھا کرتے تھے ان کے حجرے میں ایک دن شیطان انسان کے بھیس میں نمودار ہو گیا۔ اور بولا حضرت یہ جو آپ میرے اوپر لعنت ملامت کیا کرتے ہیں تو کبھی آپ نے اس حقیقت پہ بھی غور کیا کہ شیطان غریب تو صرف شیرہ لگانے کا گنہگار ہوتا ہے۔ باقی کام انسان خود انجام دیتا ہے اس مرد بزرگ نے پوچھا کہ بھئی وہ کیسے ؟ اس نے کہا۔ ایک ذرا بازار تک چلیے اور تماشا دیکھیے اللہ کا وہ بندہ شیطان کے ہمراہ

بازار میں آ گیا شیطان نے حلوائی کی دکان پر شیرے کے برتن میں انگلی ڈبو دی اور کہا اب دیکھئے تماشہ۔ پھر اس نے وہی انگلی دیوار پہ لگا دی۔ جہاں پر شیرہ لگا تھا دیوار پر اسی جگہ ایک مکھی آن بیٹھی مکھی کو دیکھ کر ایک چھپکلی آ گئی اور مکھی پہ جھپٹی حلوائی کے قریب جو بنیئے کی دکان تھی وہاں ایک بلی پلی ہوئی تھی اس نے جو چھپکلی کو دیکھا تو جھپٹ پڑی اپنے شکار پر۔ چھپکلی اپنی جان بچانے کے لئے جو وہاں سے چھٹی تو حلوائی کے دودھ کے کڑھاؤ میں۔ اب کیا تھا حلوائی اور بنیئے میں تو لٹھ چل گئے اور وہ دونوں خوب سے زخمی ہوئے شیطان بولا۔ حضرت آپ نے دیکھا۔ میں صرف شیرہ لگانے کا گنہگار ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ شیرہ لگانا ہی تو بہتر ہے۔ اس سے تو ساری منصوبہ بندی ہے۔ نذیراں اور فیجا بھی شیرہ ہی تو لگانا چاہتے تھے نذیراں تو اس الجھن میں پڑی ہوئی تھی کہ گاؤں کا ماحول ہے سیدھا سادھا آس پاس اڑوس پڑوس کوئی من چلا عاشق مزاج چھو کر ا بھی نہیں آخر اس لونڈیا کے اندر بھی یہ جوالا مکھی کیسے بھڑک اٹھا نذیراں نے دل میں کہا کہ آخر تو جوانی اپنے اس رنڈی پنے پر ناز کرتی ہے تو یہ تیری ساری ودیا تو یہیں خاک میں مل گئی اگر فیجا اس بات کو پوچھ بیٹھے تو کیا جواب دیا جائے گا۔ یہ سوچ کر نذیراں اور بھی ادھ موئی ہوتی جاتی تھی۔ کہ ماں لونبوں بالکل معصوم بی بو اور بی نذیراں تم کو صرف دھوکہ گزر رہا ہوا پھر کیا ہوگا۔ کیا اس گاؤں سے رسوا ہو کر منہ کالا کرا کے ناکام لوٹنا ہوگا نذیراں اپنی جوانی کی ساری کمائی ٹھکانے لگا چکی تھی چند برس تک اور اگر یوں ہی ہاتھ پر ہاتھ دھر کے بیٹھنا پڑ گیا تو بھیک مانگنے کی نوبت آ جائے گی ابھی تک تو یہ بھرم کسی نہ کسی طرح گاؤں میں قائم تھا کہ وہ دونوں میاں بیوی ہیں اور ان کا بیٹا کویت میں ملازم ہے وہاں سے شہر کے بنک میں پیسہ بھیج دیتا ہے اور فیجا جا کر خرچ چلانے کے لئے رقم نکال لاتا ہے نذیراں سوچتی کاش وہ واقعی کسی بیٹے کی ماں اور کسی شریف آدمی کی بیوی ہوتی اور زندگی کے بقیہ دن آرام سے گزارتی اور اس کا بیٹا سچ مچ کویت میں ہوتا

اور پھر۔ پھر لیکن وہ جانتی تھی کہ وہ خود بھی رنڈی تھی۔ اس کی ماں بھی رنڈی تھی،
اور شاید اس کی ماں کی ماں بھی رنڈی تھی فجا بھی اسی قسم کا چھوکرا تھا جو کسی رنڈی
کے کوٹھے سے بدمعاش بن کر نکلا اور اتنی بڑی دنیا کے اس سفر میں اب دونوں ہی
گم کردہ منزل تھے اور اپنا مقام کھو چکے تھے اگر نذیراں نے لڑکی جنی ہوتی یا کوئی اور
لونڈیا پہلے ہی سے ہتھے چڑھی ہوتی تو ایسی مصیبت کاہے کو دیکھنا پڑتی۔ پھر یہ بھی
ہے کہ کوکھ جلی نذیراں ہمیشہ کی بانجھ نہیں ہے جب اسے پہلا پیٹ رہا ہے تو کس
قدر بے دردی سے ایک دائی نے پیٹ گرا کر کچھ ایسے داؤ پیچ دکھائے کہ ہزاروں
روپیہ انعام کا الگ اینٹھ لیا اور یہ حکم بھی لگا گئی کہ بھلے ہی نذیراں پچاس مردوں
کے پاس جا سوئے رحم کا منہ کھلے گا ہی نہیں اور نذیراں سچ مچ اس منحوس دائی کو روتی
تھی جس نے اس کی مادرانہ شفقت اور محبت کو سلا کر کیسے بھیانک جنسی جذبات بیدار
کر دیئے تھے کہ کسی طرح حبس کا بھوت اس کے سر سے اترتا ہی نہ تھا جب تک جوانی
نہ گزر گئی وہ اسی سیال آگ میں بہتی رہی۔

خیر بنوں کے بارے میں نذیراں نے سوچا کہ پہلے ذرا اچھی طرح تفتیش کر لی
جائے تو اچھا ہے یہ سوچ کر فجا کو اس کام پہ لگایا کہ وہ حمیدا سے دوستی گانٹھے اور
اسے حقے کا رسیا بنا کر باتوں میں لگائے رکھا کرے نذیراں کسی نہ کسی بہانے بنوں
کے پاس چلی جاتی یا تاک جھانک کرتی رہتی۔ کبھی کبھی تو حمیدا چاک پہ برتن بناتا ہوتا
اور بنوں اس کی مدد کرتی جاتی۔ کبھی وہ برتنوں کو پکانے کے لئے اہتمام کر رہا ہوتا تو
کبھی گدھے پہ مٹی ڈھو ڈھو کر لاتا۔۔۔ یا پکے ہوئے برتن بیچنے کے لئے بازار لے
جاتا بنوں پکانے ریندھنے یا سینے پرونے کے دھندے سے فارغ ہوتی اور نذیراں
یہ وقت غنیمت جان کر اس کے پاس جا بیٹھتی کبھی کچھ مانگنے کے بہانے کبھی کچھ
دینے دلانے کے بہانے لیکن بات نہ بنتی نہ بات کا کوئی سرا ملتا نہ کوئی ایسا ڈھب

بیٹھتا کہ وہ اسے باتوں ہی باتوں میں لگا کر کچھ کا کچھ بنا دے۔

ایک روز حمیدا گھر سے غائب تھا نذیراں بنوں کے پاس جا بیٹھی۔

"اری بیٹی۔ ذرا دیکھنا میرے سر کو، جوؤں کمبختوں نے توم توم کر بھیجا خلاص کر دیا ہے میرا تو۔"

بنوں نذیراں کے سر کی جوئیں دیکھنے لگی نذیراں نے بتیرا چاہا کہ باتوں ہی باتوں میں کھدیڑتی ہوئی اپنے موضوع پر اسے لائے اور پھر اس بھید کو معلوم کرے لیکن یا تو بنوں بہت معصوم تھی یا بہت کائیاں۔ اس نے پٹھے پہ ہاتھ نہ دھرنے دیا۔ ہاں نہیں کے سوا منہ سے ایک لفظ اور ایک حرف نہ پھوٹنا تھا نہ پھوٹی۔ نذیراں بہت جز بز ہوئی اور جی ہی جی میں کہا واہ ری نذیراں تجھ جیسی کا ایک معمولی سی لونڈیا یہ حشر کر رہی ہے کہ انگلیوں پہ نچا رہی ہے اور اپنا راز اگل کر نہیں دیتی ایک روز یہ دیکھ کر کہ بنوں اپنے دروازے کے پٹ سے لگی کھڑی دور میدان میں کچھ تک رہی تھی۔ نذیراں کا ماتھا ٹھنکا۔ اور جی ہی جی میں وہ خوش ہوئی کہ چلو آج مار لیا پالا۔ لیکن اب جو اس نے نگاہ اٹھا کر میدان کی طرف دیکھا تو بندر والا بندر نچا رہا تھا اور بچوں کی ٹولیاں جمع تھیں۔ بہت دن اسی طرح گزر گئے فجا بھی نذیراں کے فن پہ شک وشبہ کا اظہار کرنے لگا۔ اور گالیاں دے دے کر اسے طعنے دینے لگا بلکہ اس نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ اس گاؤں میں اپنا داؤں نہیں چلے گا یہاں سے بوریا بستر گول کر کے کسی اور جگہ قسمت آزمائی کرنا پڑے گی۔ لیکن نذیراں تھی کہ ہتھیار ڈالنے پہ آمادہ نہ ہوتی تھی۔ پہ نہ ہوتی تھی۔

ایک روز بنوں اپنی کوٹھڑی میں آئینے کے سامنے کھڑی چوٹی گوندھ رہی تھی اور گنگنا رہی تھی کہ نذیراں چپکے سے وہاں جا پہنچی۔ بنوں کچھ دنوں سے چونکنی سی رہنے لگی تھی اسے نذیراں کی پراسرار حرکتوں پہ شک وشبہ گزرتا تھا کہ وہ کسی خاص مشن

یہ لگی ہوئی ہے۔ لیکن کبھی وہ اسے اپنا وہم قرار دیتی اور کبھی یہ سوچتی کہ آخر وہ کون سا شخص ہو سکتا ہے پھر اس خیال سے کہ ندیراں یہاں اکیلی عورت ہے اس لیے اس کا جی گھبراتا ہو گا یا خود بنوں کی تنہائی کا خیال کر کے شاید وہ آجاتی ہو گی۔ غرضیکہ ندیراں کی آہٹ پا کر وہ خاموش ہو گئی۔ ندیراں مسکرائی اور بولی۔

" چپ کیوں ہو گئیں بنوں، گاؤ نا "

بنوں چپکی رہی صرف ذرا سا مسکرا دی۔ اس وقت کہیں سے حمید آن ٹپکا۔ اور ندیراں اپنے گھر لوٹ آئی۔ گھر میں قدم رکھتے ہی اس نے دیکھا کہ فجا ایک نوجوان شہری بابو کے آگے پیچھے گھوم رہا ہے اور صدقے قربان جا رہا ہے ندیراں کو دیکھتے ہی بولا۔

ارے ندیراں دیکھ تو سہی، یہ اپنے بابو جی شہر سے آئے ہیں۔ کوئی کتاب وتاب لکھ رہے ہیں۔ ہیں نا باؤ جی" اور گٹھے ہوئے جسم کے نوجوان نے جو انگریزی لباس میں ملبوس تھا۔ سیاہ چشمہ لگائے کیمرہ لٹکائے۔ ندیراں کو دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ اثبات میں گردن ہلا کر کہا۔ ہاں میں گاؤں کی زندگی پر تھیسس لکھ رہا ہوں۔ میرا مطلب ہے کتاب لکھ رہا ہوں ۔ ۔ ۔ یہ سادہ سا گاؤں ۔ ۔ ۔ یہ سادہ سی زندگی ۔ ۔ ۔ یہ سادے سادے لوگ ۔ ۔ ۔ اور یہاں کے سادہ سادہ رسم ورواج۔ لیکن ندیراں لپکی صدقے واری گئی اور خیر مقدم کرتے ہوئے بولی۔ جی آیاں نوں ۔ ۔ ۔ باؤ جی جم جم آؤ۔ نت نت آؤ" اور پھر فجا بولا۔" نی ذرا منجی ڈال دے۔ لسی پلا باؤ جی کو، میں پنکھا جھلتا ہوں نوجوان جو اس غیر متوقع مدارت پر کسی قدر متوحش سا تھا۔ ایچی کی طرف لپکا۔ لیکن قبل کہ نوجوان ایچی پر جھپٹتا ندیراں اینچی اٹھا کر اندر کے دالان میں چلی گئی فجے نے پلنگ بچھا کر نوجوان کو زبردستی بٹھا دیا اور لگا پنکھا جھلنے، ندیراں جھٹ سے لسی بنا لائی غرضیکہ شام ہوتے ہوتے نوجوان کسی قدر ان سب میں گھل مل گیا اور گاؤں کے بارے میں کرید کرید کر پوچھنے اور اپنی نوٹ بک میں لکھنے لگا۔ ندیراں نے فجے سے

آنکھ مار کر کہا کہ وہ کسی طرح بنوں کو کوٹھے پر لائے تو نوجوان کو وہ صحن میں لے کر نکلے کہ کچھ کام بنے۔ نذیراں جھٹ بنوں کے پاس جا پہنچی اتفاق سے حمیدا گھر میں موجود نہ تھا بولی "بیٹی ذرا کوٹھے پر چل، ایک چیز تجھے دکھاؤں"

بھولی بھالی بنوں کوٹھے پہ جا چڑھی اُدھر نوجوان کو نجا لیکر صحن میں آیا۔ دونوں کی آنکھ چار ہوگئی۔ بنوں شرم سے سرخ ہوگئی اور فوراً نیچے اتر گئی نذیراں بھی ساتھ ساتھ آگئی اور بولی "میں تو تجھے اپنے بیٹے کو دکھانے لائی تھی کہ تجھے پسند ہو تو حمیدے سے اس کے لئے تجھے مانگ لوں مجھے کیا خبر تھی کہ نگوڑا تجھے یوں گھورنے لگے گا دیکھو ابھی جاکر ڈانٹتی ہوں"

بنوں جو سچ مچ نوجوان کو پسند کرنے لگی تھی۔ بولی "نہیں خالہ ڈانٹنے کی ضرورت نہیں"

نذیراں بولی "تو تجھے پسند ہے میرا بیٹا... بات کروں پھر"

بنوں چہرے کو دونوں ہاتھوں سے چھپاکر کوٹھڑی میں بھاگ گئی۔ اور نذیراں کھل گئی۔ نجے کو بھی خبر لگ گئی تھی کہ تیر نشانے پہ بیٹھا ہے نوجوان خاصا مضطرب ہو گیا اور بار بار لگا حمیدا کمہار کے کوٹھے کی طرف دیکھنے نجا بھانپ گیا کہ معاملہ بالکل صحیح سمت میں چل نکلا ہے بس دو ہی چار دن میں پو بارہ ہیں۔

رات میں نذیراں نے نوجوان کا پلنگ اپنے کوٹھے پہ بچھایا اور خود نیچے نجے کے ساتھ گرمی اور امس میں پڑی رہی، مگر اسی تاک میں رہی کہ کب بنوں اپنی دیوار پر چڑھ کر اس کے کوٹھے پہ آتی ہے نوجوان کبھی چھت پر ٹہلتا تھا۔ کبھی اٹھ اٹھ کر پانی پیتا تھا۔ جب آدھی رات ڈھلی۔ اور وہ سوتا پڑ گیا تو دو سائے حرکت کرتے ہوئے دیوار کی اوٹ میں چھپ رہے صبح کی اذان ہوئی تو بنوں دھیرے سے چھپ سے اتر کر اپنی طرف چلی گئی۔ اب نذیراں کو دوسری فکر لاحق ہوئی کہ کہیں نوجوان نے

بنوں پر یہ مجاہدانہ چھوڑ دیا ہو کہ ہم دراصل اس کے کوئی رشتہ دار نہیں ہیں جب اس کا اظہار اس نے مجھ سے کیا تو وہ کھنکھار کر بولا "بڑی بنتی ہے رنڈی، اری مجھے نے کچی گولیاں نہیں کھیلی ہیں۔ باؤ کو بتا دیا ہے کہ گاؤں میں رہنا ہے تو ہمارا بیٹا بنکر رہنا پڑے گا نہیں تو گاؤں والے"

نذیراں مجھے کے اس مکر پر صدقے قربان ہونے لگی۔ اور بولی کہ بنوں نوجوان کے ساتھ آدھی رات تک رہی ہے مجا خوش ہو گیا۔ اور بولا کہ "تو سچ کہتی تھی۔ بتول پکا ہوا پھل ہے جو بھی گود پھیلا دے اسی کے دامن میں آن گرے"

نذیراں بولی "پر اب سوچ کیا ہو گا"

مجا بولا "ہو گا کیا، لونڈیا کو پیٹ رہے گا۔ حمیدا یا تو مار پیٹ کر گھر سے نکال دے گا یا خود جان دے دے گا لونڈیا ہمارے متھے چڑھ جائے گی دونوں طرح"

"اور اگر اس نے غیرت میں لونڈیا ہی کو مار ڈالا تو۔۔۔۔" نذیراں نے اندیشہ ظاہر کیا،

"یہ بات تو مجھ پر چھوڑ دے" مجا بولا، اور باؤ کو نیچے اترتے دیکھ کر اس کے خیر مقدم کو لپکا۔ بولا۔

"نیند تو اچھی طرح آئی۔ اور یہ ہوا ٹھنڈی تھی نا!"

نوجوان بولا۔ "بہت خوب بہت خوبصورت نیند آئی"

اور گنگناتا ہوا اندر جا کر اپنی کیس اٹھا لایا۔ شیو کا سارا سامان نکال کر بیٹھ گیا مجا ناشتے کا سامان لینے بازار چلا گیا اور نذیراں لپک کر بنوں کے گھر داخل ہو گئی حمیدا چاک چلا رہا تھا۔ بولا

"بہن نذیراں۔ بہت خوش ہے کیا بات ہے"

نذیراں بولی۔ "بھائی بیٹا آیا ہے۔ کیسے نہ خوش ہوں۔ بتول بیٹی جینے کے بعد"

مل جائیں گے،،

بنوں جو مارے خوشی کے پھولی نہ سماتی تھی بولی۔" ہاں ہاں خالہ جو چاہیے ہوئے جائے،
بنوں کے قریب جاکر حمیدا کی آنکھ بچا کر اس نے پیار کیا اور چپکے سے کان کے پاس منہ لے جاکر بولی

" چندا سی دلہن بنے گی میری بنوں" اور چپکے سے نہایت آہستہ سے بولی۔ پسند آیا میرا بیٹیا۔ ہے نا چاند سورج کی جوڑی،،

بنوں شرما کر پھر کوٹھری میں چلی گئی تو نذیراں گھر واپس آ گئی اور وہ بھید پاگئی جو نذیراں کی آنکھوں سے چھلک رہا تھا۔ نوجوان اب بھی گنگنا رہا تھا نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں اور نذیراں دل ہی دل میں ہولے ہولے مسکرا رہی تھی کہ اس کارساز نے کس خوبی سے گھر بیٹھے سارا انتظام کر دیا۔

چند روز نوجوان اور بھی رہا دن کو ادھر ادھر نکل جاتا، تصویریں اتارتا۔ لوگوں سے ملتا ملاتا مجھا ہر ایک کے بارے میں بتاتا پھرتا اور ہر ایک سے اکڑ اکڑ کر اس کا تعارف بھی کراتا جاتا رات میں بنوں اور اس نوجوان میں ملاقاتیں ہوئیں اور نذیراں مجھے سے یا تو باتیں کرتی جاتی یا مجا سو جاتا اور نذیراں دل ہی دل میں منصوبے باندھتی رہتی اور من ہی من میں باتیں کرتی جاتی پھر وہ نوجوان ایک صبح روانہ ہو گیا بنوں دروازے کے پٹ سے لگی ہوئی اسے دیکھتی ہی رہ گئی۔ اور آنچل سے آنسو پونچھتی رہی نذیراں چپکے چپکے یہ سب کچھ دیکھتی رہی۔

چند دن گزرے پھر دن ہفتے میں بدلے اور ہفتے مہینوں کی مسافت میں چلنے لگے۔ بنوں بیچاری کو پردیسی نوجوان کا انتظار رہا اور نذیراں کو بنوں کے جسمانی انقلابات کا انتظار رہا کہ کسی نہ کسی دن بنوں نذیراں کے کندھے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے گی اور بس اسی دن ان کے بھاگ جاگ جائیں گے اور علم کیمیا کا نسخہ

ان کے ہتھے چڑھ جائے گا۔ اور پھر گویا من مید سنے لگے گا۔ لیکن نہ تو بنول کے جسم میں کوئی تبدیلی ہوئی اور نہ وہ پھوٹ پھوٹ کر روئی اور نہ پردیسی کا کوئی اتہ پتہ لگا۔ ایک دن اوب کر فجے نے کہا: "نذیراں یہ معاملہ تو سوکھا ہی ٹل گیا اری اب تو مجھے بالکل امید نہیں رہی۔ کچھ تو کر بھاگوان!"

نذیراں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا: "تو ٹھیک کہتا ہے فجے۔ اب تو نشے پانی کو بھی پیسے نہیں ہوتے کچھ دن اور یونہی گزرے تو روٹی کی بھی آس ٹوٹ جائے گی!"

سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ بنول کچھ دن تو پردیسی کے فراق میں بے چین رہی پھر جیسے رفتہ رفتہ اس کو بھی اطمینان سا ہونے لگا نذیراں اکثر اپنے فرضی بیٹے کا ذکر کرتی تھی تو اک ذرا کی ذرا بنول مسکرا دیتی، اور پھر وہی سکوت نہ منہ سے بولتی نہ سر سے کھیلتی نہ کر کھٹا نہ بیٹھا نذیراں چوروں کی طرح کئی کئی بار جا جا کر خبر لیتی مگر بنول اپنے کام دھندے میں مگن ملتی۔

ایک روز فجے نے نذیراں سے کہا کہ "آج رات میں دوسرے گاؤں سے کوئی گاہک پھنسا کر لاتا ہوں۔ تو اس حرامزادی کو چپکے سے جا کر بتا دے کہ باؤ آج رات کی رات آئے گا صبح ہوتے چلا جائے گا۔"

"نا نا ایسا غضب کبھی نہ کرنا۔ بنول گاؤں کی عزت ہے، ہماری نوچی نہیں لونڈی نہیں کہ ہاتھ پکڑ کر جس کے حوالے چاہا کر دیا۔ ایسی کالک لگے گی کہ جیل میں سیدھے پہنچے ہو گے دونوں کے دونوں ۔۔ کھانا گرم ہو تو والے ٹھنڈے کر کر کے ہولے ہولے چباؤ، پھر آسانی سے کھاؤ۔۔۔!"

"ٹھنڈے کر کے کھاؤ" فجے غرایا۔ اری اس انتظار میں تو اب ہم خود ٹھنڈے ہوئے جا رہے ہیں۔ نہ دوا دارو، نہ چرس نہ پوست۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے۔ لعنت ہے ایسی زندگی پہ، دیکھ کچھ دن اور یہی حال رہا تو میں سچ کہتا ہوں۔ نذیراں کسی ندی نالے میں

کر کے جان دے دوں گا!"

"بس۔ نذیراں بولی"۔ "اتنے ہی میں بول گیا! ارے مجھے دیکھ اصل دیسی کی پوری بوتل اڑاتی تھی۔ کیسی کیسی ولایتی ایک سے ایک بڑھیا شراب پی ڈالیں اور اب برسوں گزر گئے... کچھ کہا میں نے تجھ سے بول بھلا کیا کہا میں نے تجھ سے"

فیجے نے حقہ اٹھایا اور باہر نکل گیا۔ نذیراں اپنے ماضی کے عیش و آرام کے تصورات میں کھو گئی۔

رات ابر آیا اور خوب بارش ہوئی، حمید اکبار گھر لوٹ کر نہیں آیا۔ بنوں گھر پر اکیلی تھی۔ نذیراں اس کے پاس چلی گئی اور فیجے سے کہتی گئی کہ آج کی رات اگر کوئی آجائے تو بہت اچھا موقع ہے، مگر ایسی اندھیری اور برسات سے بھری رات میں بھلا کسی بھیڑیے گاؤں کی طرف کون نکلتا ہے کسی کو نہ آنا تھا نہ آیا۔ ساری رات نذیراں کو ادھر اور فیجے کو ادھر کھانستے کھنکھارتے گزر گئی۔ صبح ہوتے بارش رک گئی تو بنوں اٹھ کر گھر کے کام کاج میں لگ گئی۔ نذیراں کی بنوں کے بستر پر نظر پڑی تو پردیسی نوجوان کی تصویر تکیے کے نیچے سے جھانک رہی تھی اس نے تکیہ اٹھایا تو ڈھیر سے خطوط گر پڑے جن میں محبت کی خوشبو بسی ہوئی تھی نذیراں نے لرزتے ہاتھوں سے خط واپس تکیے کے نیچے رکھے تو بنوں نے دیکھ لیا اور پرے سے مسکرا دی۔ ابھی نذیراں اپنے ہوش و حواس پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی کہ حمید ابد حواسی کے عالم میں گھر میں داخل ہوا۔

"اری بنوں، وہ اپنے پردیسی باؤ کے گھر والے سارے کے سارے پہنچ گئے ہیں قاضی بھی ساتھ لائے ہیں باؤ کہتا ہے کہ نکاح کر کے آج ہی لے جائے گا سارے لوگ پیر صاحب کی خانقاہ میں ٹھہرے ہوئے ہیں اری نذیراں بہن تو میری دل کو دلہن بنا دے"

نذیراں نے جیسے کچھ سنا ہی نہیں۔ ایسی سن ہوئی کہ جیسے پاتال میں دھنس گئی ہو!

سانچ کی آنچ

اس نے آنکھیں بند کیں اور اپنے پیر و مرشد کے متبرک ہاتھوں کو بوسہ دیا اور دل ہی دل میں چپکے سے اقرار کیا کہ اب تک جو ہوا سو ہوا پر اب سے وہ ہمیشہ سچ بولے گا اور سچ کے سوا کچھ نہ بولے گا آنکھیں کھول کر پیر و مرشد کو دیکھا تو ان کے نورانی چہرے پہ ہلکا سا تبسم نمودار ہو چکا تھا جیسے انہوں نے اس کی روح کی پاکیزگی کو دیکھ لیا ہو اور اس کے دل کی گہرائیوں میں اتر کر اس نور کو دیکھ لیا ہو جو ابھی ابھی پیدا ہوا تھا اور جس نے اس کے باطن کے اندھیرے کو دور کر دیا تھا اس کے قلب کی تاریکی اس کی روح کی تیرگی کو کافور کر دیا تھا اس نے ایک بار پھر اپنے پیر و مرشد کے دست مبارک کو چوما اور الٹے قدموں چلتا ہوا اپنی گاڑی میں آ بیٹھا۔ شوفر کو چلنے کا اشارہ کیا اور سوچنے لگا کہ آخر یہ نور جو ابھی ابھی اس میں جاگا ہے، ہے کیا؟۔

ہے کیا؟ وہی ہے جو نور ہوتا ہے یعنی نور نور ہوتا ہے جو ظلمات کو کھا جاتا ہے باطل سے نبرد آزما ہوتا ہے اور اس کے سیاہ دامن کو تار تار کر دیتا ہے لیکن چونکہ وہ صنعت کار تھا اور ہر چیز کو اس کے مادی پیکر میں دیکھنے کا عادی لہذا اس نے سوچا کہ یہ نور کس طرح کس مقدار میں انسان کی روح کے کس مقام پر جنم لیتا ہے تو اب یہ ایک نیا سوال پیدا ہو گیا کہ بھئی یہ روح کیا ہے لوگ کہتے ہیں کہ نہایت لطیف جوہر ہے خوشبو ہے، عطر ہے اور نور اسی روح کا جوہر ہے گاڑی آہستگی سے رکی۔ شوفر نے ادب سے دروازہ کھولا خدمت گار نے بریف کیس سگریٹ کی ڈبیہ لائیٹر وغیرہ اٹھا کر

نہایت ادب سے پیچھے پیچھے چلنا شروع کیا۔ لفٹ کا دروازہ کھولا گیا لفٹ مین نے ادب سے سلام کیا اور پلک جھپکتے ہیں وہ بالائی منزل پر پہنچ کر اپنے ائر کنڈیشنڈ دفتر میں آ پہنچا اور اپنی کرسی پر بیٹھ کر سلسلہ پھر وہیں سے جوڑا کہ یہ روح ہے کیا، سگریٹ سلگا کر اور آنکھیں بند کر کے اس نے خود اپنے اندر اتر کر سوچا کہ میں کیا ہوں، کون ہوں، کیا تھا کیوں تھا، کہاں تھا، کب سے تھا، اور آیا بھی تھا کہ نہیں۔ یا محض واہمہ ہے قیاس ہے معاً اسے ایک مغربی مصنف کا ایک دلچسپ مضمون جو روح پر بحث کرتا تھا یاد آیا کہ روح ایک نور ہے۔

نور ہے۔ وہ کیسے؟ تو اسے خیال آیا کہ مغربی مصنف انسان کے جسم میں زندگی کے استقرار کا سبب خون کو مانتا ہے۔ خون جو جسم کے شریانوں میں، رگوں پٹھوں اور دل و دماغ میں دوڑتا ہے اور اسی گردش یا دوران خون سے زندگی عبارت ہے لہو نکال دو تو انسان ہو کہ حیوان، مرجاتا ہے کیونکہ روح نکل جاتی ہے تو گویا روح اسی خون میں ہے اسی خون میں، جو سرخ رنگ کا سیال ہے انسانوں اور حیوانوں میں زندگی بن کر دوڑتا ہے، لپکتا ہے اچھلتا ہے، ہمکتا ہے رقص کرتا ہے پرواز کرتا ہے، جھپٹتا ہے مگر یہ خون ہے کیا بلا؟ لو بھئی یہ ایک نیا سوال تیار ہو گیا۔ تو خون۔ ہاں سرخ اور سفید ذرات کہو یا خلیے کہو ان سے بنا ہے تو بس روح انہیں خلیوں میں ہوتی ہو گی نہیں تو پھر کہاں ہو گی یہ خلیے کیا ہیں، سرخ کیا ہیں، اور سفید کیا ہیں کہاں سے آئے اور کیونکر بنے ہیں۔!

اس نے ایک اور سگریٹ سلگایا اور اس گتھی کو سلجھانے بیٹھ گیا کہ وہ جو نور ابھی ابھی اس کی روح میں جاگا ہے اور اس کے خون میں دوڑ رہا ہے، ہے کیا اور خون میں دوڑتی ہوئی، بہتی ہوئی روح میں بسا ہوا یہ نور آیا اچانک پیدا ہو گیا ہے یا پہلے ہی سے موجود تھا اور اسے خبر نہ تھی یا موجود تو تھا لیکن اس پر باطل کا سیاہ لبادہ

جیٹھا ہوا تھا جسے اس کے پیرو مرشد کی توجہ نے چاک چاک کر دیا۔ اس نے پھر آنکھیں بند کیں اور پیرو مرشد کے لئے ممنونیت کے جذبات سے مملو ہو گیا آنکھوں میں نمی آ گئی اور دل میں رقت پیدا ہو گئی۔

مگر پھر وہی وسوسہ کہ یہ خون کے سرخ و سفید خلیے کیا ہیں اور ان میں روح کس مقام پہ کارفرما ہے تو صاحب اب ذرا ان سرخ و سفید ذرات اور ان خلیوں کی تقسیم کے عمل سے گزر ئیے۔ حتیٰ کہ ایک مقام پہ پہنچ کر آپ پہ یہ انکشاف ہو گا کہ اب مزید ٹکڑوں میں ان کا بانٹنا ممکن نہیں اور نہ کسی طاقت ور مائیکرو اسکوپ سے انکی دید ممکن ہے لیکن اس آخری ٹکڑے میں آخر ہے کیا۔ سائنس کہتی ہے کہ روشنی ہے۔ مذہب کہتا ہے کہ یہی روح ہے تو اسی روح میں یہ روشنی پیدا ہو گئی۔ یعنی روشنی ہی روشنی پیدا ہو گئی۔ بھلا یہ کیا بات ہوئی کہ روشنی میں روشنی ہو گئی یوں کہو کہ مدھم روشنی ذرا تیز ہو گئی۔ چراغ کی لو ذرا اونچی ہو گئی تو اب بات یوں ہوتی نا کہ روح کی روشنی جو پہلے ماند تھی اب پیرو مرشد کی توجہ سے ذرا تیز ہو گئی۔

"یس سر"

اس کی سیکرٹری مختصر نویسی کے لئے تیار بیٹھی تھی۔ آج بھی اس نے شوخ سا رِبن بالوں میں باندھا تھا جسم کی تمام قوسوں کو خوب نمایاں کیا تھا کولہوں پہ تنگ سی جینز پہنی تھی اور علین اس کی نشست کے قریب بیٹھی تھی اس کی پسندیدہ خوشبوؤں میں نہائی ہوئی لیکن ہاتھ کے اشارے سے جب اس نے مختصر نویسی سے منع کیا تو سیکرٹری نے کیبن کے باہر انتہائی مصروف کی تختی لگا دی اور میز پہ اس کے پسندیدہ ولائتی مشروب سجا کر جام تیار کر لائی، اس نے بے خیالی میں ایک گھونٹ ہی سپ کیا ہو گا کہ خود بخود چونکا اور یوں اپنی سیٹ پہ اچھلا جیسے بچھو نے ڈنگ مار دیا ہو۔

"اوہ نو" پھر آنکھیں موند کر گویا اپنے پیر و مرشد کے حضور میں پہنچ گیا۔ "سوری سر۔ ایکسٹریملی سوری" اُسے سیکرٹری کو بادل ناخواستہ جام و مینا کی بساط لپیٹنا پڑی۔ تختی جو آویزاں کی گئی تھی اُتارنا پڑی اور ابھی کوئی کام شروع کرنے نہ کرنے میں وہ متامل تھا کہ خود بخود اس کی انگلیاں فون کے ڈائل پہ پہنچ گئیں۔ حسب عادت اس نے بازاروں کے نرخ معلوم کئے، کچھ کاغذات دیکھے اور دنیا کے ملکوں میں پھیلے ہوئے اس نظام تجارت میں اس بات پہ غور کیا کہ نفع کا اصل منبع کہاں ہے اور نفع پہنچ کہاں رہا ہے۔ اور یہ کہ اس سارے نظام تجارت میں وہ خود کہاں پہ کھڑا ہوا ہے اور کھڑا ہوا خاک ہے بندھا ہوا ہے ان دھاگوں سے جو نظر نہیں آتے۔ لیکن ان کے بندھنوں نے کتنے ملکوں اور کتنی قوموں کو جکڑ رکھا ہے۔ معیشت کا یہ نظام کیسا جبر ہے۔ اور اس جبر و تعدی میں کس قدر مکر و فریب، مکائد اور جال ہیں اور وہ چلا ہے سچ بولنے سچ جس کی خاطر سقراط کو زہر پینا پڑا تھا اگر وہ اس نظام معیشت میں سچ بولنا شروع کر دے تو قدم قدم پہ لاکھوں کروڑوں بار سقراط بننا پڑے گا گویا مر کے جینا پڑیگا اور جی جی کے مرنا پڑے گا۔

وہ گھبرا گیا۔ دفتر سے باہر نکلا نیچے پہنچ کر گاڑی میں بیٹھا شوفر کو کلب کی طرف چلنے کا حکم دیا یہاں اور بھی چند سرمایہ دار، صنعت کار اور تجار موجود تھے۔ کوئی جام پہ جام چڑھا رہا تھا اور بین الاقوامی منڈیوں پر تبصرے کر رہا تھا کچھ لوگ اپنے خاندانوں سمیت لنچ تناول کرنے کے لئے آئے ہوئے تھے اور نرم نرم قالینوں پہ احتیاط سے چل رہے تھے ٹھنڈی اور خنک روشنیوں میں رنگ برنگے پھولوں کے گلدستے جگہ جگہ پہ سجے اور شیشوں پہ پردے کھینچے ہوئے تھے اور وہ سوچ رہا تھا کہ پسماندہ یا ترقی پذیر ممالک کے صنعت کار جس ڈور سے بندھے ہوئے ہیں یا پھنسے ہوئے ہیں ان کی حیثیت چھوٹی چھوٹی مچھلیوں کی سی ہے جنہیں بڑی مچھلیاں

حسب اشتہا ہڑپ کرتی رہتی ہیں۔

اس کے مخصوص ویٹر نے آکر اس سے کچھ پوچھا مگر اس نے صرف سیب کے جوس کا آرڈر دے کر معاً پھر یہی محسوس کیا کہ روشنی جو اس کے اندر جاگی تھی ابھی تک بدستور اس کی روح میں جاری و ساری ہے تیرتی پھرتی ہے اور قلب و ذہن کے مابین گھومتی جاتی ہے اس کے آس پاس اِدھر اُدھر صنعت کاروں کی اہم شخصیتیں موجود تھیں لیکن وہ ان سب سے بے نیاز اپنی روح کے جگمگاتے ہوئے معبد میں اترا ہوا سوچ رہا تھا کہ جو مزہ اس روشنی میں ہے اور کہاں ہے یا بعض اہم صنعت کار اس کو ہلو ہلو کرتے چلے گئے ایک آدھ نے اس کا شانہ بھی تھپتھپایا، کوئی بات بھی کہی، چند شعلہ رخ معشوقوں نے نگاہوں سے چھیڑ چھاڑ بھی کرنا چاہی لیکن یہ سب فضول تھا کیونکہ وہ اپنے خارج سے کٹا ہوا اپنے بطون کے نہاں خانے میں سیر کرتا پھر رہا تھا آنے والوں کا ہجوم بڑھتا جا رہا تھا چھوٹی موٹی تجارتی کانفرنس کا سا سماں پیدا ہو چلا تھا کہ وہ اس ہجوم سے بھی بھاگا گاڑی سمندر کنارے ایک ویران سے مقام پہ آکر رک گئی اور وہ ایک شکستہ سے مینار پہ جا بیٹھا۔

سمندر کی امواج ایک دوسرے میں لپٹی ہوئی گتھی ہوئی چادریں کی چادریں بن بن کر اور ساحل سے آ آ کر ٹکرا رہی تھیں۔ سمندر کی یہ لہریں واپس جاتے ہوئے ریتیلے ساحل پہ ریت کے جو نشانات چھوڑ جاتیں دوسری بار آنے والی لہریں ان نشانات کو مٹا ڈالتیں اور نئے نقوش ثبت کر جاتیں اس نے سوچا یہی عمل اس کے اندر بھی جاری ہے خیالات، جذبات اور احساسات کی موجوں کی چادریں امڈ امڈ کر اور دوڑ دوڑ کر یلغار کرتی ہیں اور اندر ہی اندر کچھ نشانات بناتی ہوئی گزر جاتی ہیں معاً اس میں ایک نیا خیال جاگا۔ ملک کے شمالی مشرقی علاقے کے ایک شہر میں ایک بزرگ کے مزار پہ جب وہ آنکھیں بند کئے عقیدت سے کھڑا دعائیں مانگ رہا تھا تو جیسے کسی نے

چپکے سے اس کے دل کے کان میں سرگوشی کی تھی ذرا پہلو میں تو دیکھ اور جب اس نے آنکھیں کھول کر پہلو میں دیکھا تھا تو ایک خوبصورت اور مہ جبیں موجود تھی اور دعا میں مصروف تھی اس بات کو بزرگ کا اشارا سمجھ کر اس نے اس مہ جبیں کا تعاقب کر کے اس کے تمام کوائف معلوم کئے تھے اور پھر اس سے نکاح کر لیا تھا جس کے بعد سے مسلسل اس کا کاروبار ترقی کر رہا تھا اور وہ مہ جبیں اب اس کی محبوب اہلیہ تھی یعنی یہ روشنی ایک شعور بھی ہے، یہ روشنی کلام بھی کر سکتی ہے وہ کلام جسے دل کے کان سن سکتے ہیں اس نے سمندر کے کنارے چٹان پہ بیٹھے بیٹھے آنکھیں بند کیں اور سوچا کہ اس روشنی میں اگر قوت ناطقہ ہے تو یہ بولے گی وہ دیر تک آنکھیں بند کئے بیٹھا رہا کہ روشنی کلام کرے لیکن سمندر کے پانی کے شور کے سوا کچھ سنائی نہ دیا چند آبی پرندوں کے جھنڈ شور کرتے گزر گئے کچھ بچے کچھ عورتیں سمندر میں نہانے کے لئے آ گئے اور اس نے سوچا کہ یہ روشنی جو جاگی ہے وہ اس سے یہاں کلام نہیں کرے گی، مگر کلام کرے گی ضرور، اسے انتظار کرنا چاہیئے اسی لمحے اس کے دل نے کہا لاہور چلو۔ لاہور یعنی ابھی اور اسی وقت، گاڑی میں بیٹھ کر وہ سیدھا شہر آیا اور پی آئی اے کے دفتر میں فون کر کے سیٹ لی، گھر پہ مصروفیت کا بہانہ کیا اور جہاز میں جا بیٹھا، جہاز کی پرواز کے وقت اس نے پھر آنکھیں بند کر کے اپنے بطون میں جھانکا اور اس روشنی سے دریافت کیا کہ آخر وہ کیا کہتی ہے مگر وہ خاموش رہی۔ اس نے بھی ڈیڑھ گھنٹے کا سفر خاموشی میں گزار دیا اور لاہور پہنچتے ہی سیدھا اسی بزرگ کے مزار پہ جا پہنچا اور بدستور آنکھیں بند کئے دیر تک کھڑا رہا کہ اب شاید کوئی حکم ملے اب شاید نور کی زبان کلام کرے اب شاید کوئی آواز اس کے دل سے ٹکرائے، مگر کسی طرح کی کوئی آواز نہ آئی۔ اس پہ وہ رو دیا، اس کی آنکھیں نمناک ہو گئیں کہ شاید بزرگ موصوف اس سے ناراض ہو گئے ہیں جو دل پہ الہام کی بارش نہیں ہوتی، بارش ہوتی ہے تو اس کی بوندیں دل کی سرزمین

پر ٹپکتی ہیں اور آواز پیدا ہوتی ہے۔ مگر یہ کیا یہاں تو کوئی آواز نہیں آتی، کیا سچ مچ بزرگ موصوف اس سے خفا ہیں کیا اس کا دل پہلے کی طرح پاک و پاکیزہ نہیں رہا۔ کیا اب بھی اس پر وہ توجہ نہیں ہوگی جو پہلے تھی ——— مگر وہ روشنی، ہاں وہ روشنی کہاں ہے۔ ٹھیک ہے وہ روشنی تو ہے دل میں ایک جگہ۔ ایک گوشے میں چھپی بیٹھی ہے البتہ روشنی نے کلام کرنا چھوڑ دیا ہے۔ کوئی بات نہیں وہ بزرگ موصوف کے پاس پھر آئیگا بار بار آئے گا اور جب تک روشنی اس سے کلام نہیں کریگی وہ لاہور کے دامن سے چمٹا رہے گا۔

یہ فیصلہ کرتے ہی اسے قدرے آرام ملا اور شہر کے سب سے بڑے ہوٹل میں آکر ٹھہر گیا، گھر فون کر دیا کہ کاروبار کے سلسلے میں لاہور میں قیام کرنا پڑ گیا ہے پھر اس نے سوچا کہ وہ فیصلہ کہ وہ جھوٹ نہیں بولے گا، ختم ہو چکا ہے کیونکہ اپنے گھر والوں سے یہ دوسری مرتبہ جھوٹ بول رہا تھا ——— تو کیا اسی سبب سے روشنی روٹھ گئی ہے جو اس سے کلام نہیں کرتی۔ نہیں نہیں یہ جھوٹ نہیں یہ تو سچا کاروبار ہے یہ تو ایمان کا کاروبار ہے جب تک یہ کاروبار درست نہ ہو سارے کاروبار بے کار ہیں اپنے دل کو اچھی طرح سمجھا بجھا کر وہ اپنے بستر پہ دراز ہو گیا، اندھیرا کر دیا اور اس اندھیرے میں دل کی روشنی سے ایک بار پھر رجوع کیا۔ ابھی قلب کے مرکز پر روشنی کا دائرہ حرکت کر رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی، اس نے بتی جلائی اور فون کا ریسیور اٹھایا ———

" ہلو "

باریک نسوانی آواز نے انگریزی میں پوچھا کیا آپ فلاں فلاں بول رہے ہیں۔

جی " اس نے جواباً کہا ———

——— میں فلاں بول رہی ہوں آپ سے ملنا چاہتی ہوں ——— "

اسی وقت؟ " ——— وہ بوکھلایا ———

"یعنی رات میں۔"

اس کے جواب میں وہ ہنسی جیسے ایک ساتھ بہت سی نقرئی گھنٹیاں بجی ہوں پھر اس نے شاعرانہ انداز میں کہا۔

"بھیگتی ہوئی رات آنکھوں آنکھوں میں گزار کر دیکھئے"

اب یہ دعوت صاف تھی مگر اس نے معذرت کی اور فون بند کر دیا، اور پھر اس روشنی کے درپے ہو گیا جس کا مرکز دل تھا اور جو کلام نہیں کر رہی تھی اور وہ اس سے ہم کلام ہونے کے لئے تڑپ رہا تھا۔ بجھا کر اور آنکھیں بند کر کے وہ لیٹ گیا۔ دیر تک نیند نہ آئی، کروٹیں بدلتا رہا۔ صبح ہوتے شاید آنکھ لگ گئی خواب میں دیکھا دنیا کے سارے تاجروں کی کانفرنس ہو رہی ہے اور وہ صدارت کر رہا ہے صدارتی خطبے میں اس نے کہنا شروع کیا:

"خواتین و حضرات میں ایک پسماندہ ملک پاکستان کا معمولی تاجر ہوں میں روشنی کا کاروبار کرتا ہوں اگر آپ کو روشنی درکار ہو تو میں ایکسپورٹ کر سکتا ہوں میرے دل میں روشنیوں کا منبع موجود ہے۔" تمام تجار ہنسنے لگے کچھ نے تالیاں بھی بجائیں۔ ایک خاتون کھڑی ہو کر بولی:

"میں ماں ہوں، صرف ماں، میں نے بیٹے جنے ہیں مگر ان تاجروں نے ان بیٹوں کو باندھ کر ویت نام بھیج دیا اور وہ سب کے سب مارے گئے یہ جنگ اس لئے کرتے ہیں کہ ان کی فیکٹریاں چلتی رہیں، اسلحہ ڈھلتا رہے مائیں اپنے بیٹوں کو جنگ کی بھٹی میں ایندھن بنا بنا کر جھونکتی رہیں۔"

پھر معاً باری باری سے ہر ہر ملک کے مقتول سربراہ اٹھ اٹھ کر فریادیں کرنے لگے اور اس کی آنکھ کھل گئی میز پر سامنے اخبار پڑا تھا اور ایک بہت بڑے ملک کے بہت بڑے سربراہ کے حوالے سے ایک خبر لوں چھپی تھی۔

" صرف دو دنیائیں ہیں، تیسری کوئی دنیا نہیں "۔۔۔۔۔

ایک آزاد ملک کے کالے سربراہ کا بیان چھپا تھا۔۔۔۔۔

جب ہمارے ساحلوں پر ان کی سفید بادبانوں والی کشتیاں آ آ کر لنگر انداز ہوئی تھیں اور ان کشتیوں سے سپید لباس میں ملبوس یہ سپید فام بغلوں میں بائبل دبائے اتر اتر کر ہماری طرف آ رہے تھے تو ہم سمجھے کہ اللہ نے آسمانوں سے فرشتے ہماری ہدایت کے لئے بھیجے ہیں اور اب جبکہ کئی سو سال ہماری سرزمین پر گزارنے کے بعد ایکے جہاز ہمارے ساحلوں سے لنگر اٹھا اٹھا کر واپس جا رہے ہیں تو ہمارے ملک کا سارا سونا ان کے ملکوں میں پہنچ چکا ہے اور محض بائبل ہماری بغلوں میں دبی رہ گئی ہے "۔

اور اب آنکھ کھلنے پر وہ اس خواب کے بارے سوچ رہا تھا کہ آخر اس کا کیا مفہوم کیا ہے! کہیں اس کے پیر و مرشد کی طرف سے کوئی اشارا تو نہیں۔ روشنی ایکسپورٹ کرنے کا مطلب یہ ہوا کہ باقی دنیا کو روشنی کی ضرورت ہے اور گویا ہم روشنی میں خود کفیل ہو چکے ہیں روشنیوں میں نہائے ہوئے ہیں، روشنیوں میں ڈوبے ہوئے ہیں کہ معاً فون کی گھنٹی بجی اور موسیقی سے چھلکتی ہوئی آواز پھر اس کے کانوں سے ٹکرائی۔۔۔۔۔

" آئی ہوپ یو ہیڈ اے سویٹ ڈریم "۔۔۔۔۔

" یس آف کورس، آئی ہیڈ "۔۔۔۔۔

اور اس نے ریسیور رکھ دیا کہ اس کاروباری دنیا میں خواب ہوں کہ راتیں نیندیں ہوں کہ صبحیں ان کا مفہوم کچھ اور معنی رکھتا ہے اور وہ اس وقت کسی اور ہی دنیا میں بہہ رہا تھا اسے ہر شئے کا مفہوم کچھ مختلف النوع اور مختلف المعانی نظر آرہا تھا۔۔۔۔۔

یہ ایک خوبصورت اور خوشگوار صبح تھی جو کراچی کی مرطوب ملگجی اور مضمحل صبح سے بہت مختلف تھی۔ کراچی کی صبح بھی میلی میلی، پیلی پیلی، تھکی تھکی یرقان زدہ سی ہوتی ہے مگر لاہور کی صبح میں قدرتی رنگوں کی توانائی اور رعنائی تھی۔ آسمان صاف شفاف

خوب گہرا نیلا تھا۔ اپریل کے پھولوں میں بہار کا مژدہ تھا۔ درختوں پر طائروں کے چہچہے تھے ایسے میں پردہ ہٹا کر جو شیشے کی دیوار کے اس پار دیکھا تو ہر چیز کیف اور رنگ میں نہائی ہوئی تھی، گاؤن پہن کر وہ جلدی سے باہر آیا اور قدرت کے نظاروں پر خود کو تن تنہا چھوڑ کر بھول گیا کہ اسی پر کیف فضا میں اور صبح کی تازہ ہوا میں اپنے وجود کے ذرے ذرے کو جذب کر دے کہ معاً پھر وہی روشنی کا ہالہ اس کے دل پر مرتکز ہو گیا اور اس نے ایک درخت کے نیچے ایک پتھر پر بیٹھ کر آنکھیں بند کر لیں اور روشنی کے اس ہالے سے پوچھا ——

"تم کون ہو؟ اور میں کون ہوں؟" ——

معاً یہ خیال گزرا کہ کہیں وہ مہاتما گوتم بدھ کی طرح نروان تو حاصل نہیں کر رہا ہے اور کہیں سب کچھ تج کر وہ دنیا کے ایک لمبے سفر پر روانہ تو نہیں ہو جائے گا تا کہ اس روشنی کو عام کر سکے اور اسے پھیلا سکے۔ اگر ایسا ہو گیا تو اپنا گھر بار بیوی بچے کاروبار کو سچ مچ چھوڑ دینا پڑے گا اور سب کچھ چھوڑ کر اس کے ہتھے کیا چڑھے گا، یہی روشنی؟ روشنی کیا اسے راہبانہ زندگی کی طرف لے جائے گی اسے ہپی بنا کر ہپیوں کی گمنام منڈیوں میں گم کر دے گی اور پھر وہ ہمیشہ کے لئے گم کردہ راہ بن جائے گا اس لمحے اسے اپنے آپ سے ڈر لگا کہ کہیں سچ مچ اس کے اندر کا یہ شخص اتنا توانا نہ ہو جائے کہ اسے ترک دنیا پر آمادہ کر دے۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئی قطب مینار پر چڑھ کر اس کی آخری چوٹی پر پہنچتے ہی نیچے کودنے کا فیصلہ کر بیٹھے اس نے فوراً آنکھیں کھول دیں اور دیکھا کہ ایک حسین و جمیل تندرست اور جوان عورت اسے دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

ہلو ——

ہلو ——

دونوں نے خود ایک دوسرے کو وش کیا۔ فوراً اسے خیال گزرا کہ یہ وہی آواز ہے

جو اس نے فون پر سنی تھی آواز کی کھنک اور موسیقی اس کے سارے وجود میں رچی بسی تھی ــــ

"آپ" ــــ

"جی میں" ــــ

"بڑی خوبصورت صبح ہے"،

اس کا جواب یہ بھی ہو سکتا تھا کہ "آپ سے زیادہ نہیں"، اور سچ پوچھیے تو کوئی اور موقع ہوتا تو شاید وہ یہی کہتا بھی اور غالباً خاتون کا حسن طلب بھی یہی تھا مگر اس وقت روشنی کا مسئلہ درپیش تھا اور وہ گومگو کے عالم میں تھا یہ خوبصورت عورت بھی اسے اس ڈگر سے ہٹانے میں ناکام ہو رہی تھی لہٰذا اس نے صرف اتنا کہا:

بے شک ــــ

وہ ہال سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گیا، دھم سے بستر پہ گر آنکھیں بند کیں اور پھر سلسلہ خیال کو وہیں سے جوڑنے کی کوشش کی جہاں سے وہ ٹوٹا تھا۔ خوبصورت صبح اور خوبصورت عورت۔ یقیناً قدرت کے تحفے ہیں جن سے فرحت، نشاط اور توانائی میں اضافہ ہوتا ہے مگر یہ روشنی جس کا ہالہ اس کے دل پہ مرتکز تھا اور جس سے ہم کلام ہونے کے لئے وہ تڑپ رہا تھا اور جس کی خاطر اس نے لاہور میں قیام اختیار کیا تھا اور جس کی خاطر ابھی نہ جانے کتنے ہفت خواں اسے طے کرنے تھے۔ بار بار ظاہر ہو ہو کر غائب ہو جاتی تھی ــــ

خود بخود اس کے ہاتھ لاشعوری طور پہ اخباروں میں الجھ گئے خبریں پڑھتے پڑھتے ایک اطلاع پہ اس کی نگاہیں ٹھٹک گئیں۔ اتفاق سے اسی ہوٹل میں تاجروں کی ایک اہم کانفرنس آج ہی سے منعقد ہو رہی تھی جس میں وہ مدعو تھا اور اسے مطلقاً علم نہ تھا۔ اس نے کراچی فون کر کے اپنے تجربے کا غذات طلب کئے کہ فوراً

جہاز کی ڈاک سے بھجوائے جائیں تاکہ ضرورت پڑنے پہ کانفرنس میں وہ اپنے نقطۂ نظر کو واضح کر سکے پھر وہ سوچنے لگا کہ جو نقطۂ نظر اس نے اپنی تقریر میں اختیار کیا ہے اس میں کاروباری نقطۂ نظر سے تاجروں کا تو بہت فائدہ ہے مگر قومی اور ملکی لحاظ سے تو خسارہ ہی خسارہ ہے اور اگر پیرو مرشد کو یہ بات ناگوار گزری تو پھر اس روشنی کیا بنے گا۔ اس نے سوچا کاغذات پہنچنے پہ وہ مناسب ترمیم و تنسیخ کرے گا کیوں نہ صبح صبح بزرگ کے مزار پہ حاضری دی جائے کہ شاید صبح کی برکت سے روشنی کلام کرے اور وہ جس الجھن میں مبتلا ہے وہ دور ہو یہ فیصلہ کر کے اٹھا اور اسی حالت میں چل دیا اس نے سوچا کہ کسی معمولی سواری سے چلنا چاہیئے شاید اس طرح وہ زیادہ توجہ حاصل کرے گا۔ اپنے بزرگ کی اور پیرو مرشد کی مہربانی سے کیا پتہ کس وقت یہ روشنی کلام کر بیٹھے، کیا پتہ کب کون سا بہانہ کام کر جائے۔

صبح صبح سڑکوں پہ اکا دکا ٹریفک جاری تھا، ایک آدھ رکشا کھڑکھڑاتا اور دھڑدھڑاتا ہوا گزر جاتا، کوئی ایک آدھ اسکول کی بس یا باربرداری کا ٹرک گزر جاتا، کچھ صبح خیزوں کی ٹولیاں آتی جاتی نظر آجاتیں، رفتہ رفتہ نیند کا طلسم ٹوٹ رہا تھا اور شہر میں جاگ پڑتی جارہی تھی ایک طرف سے اچانک شور سا ہوا نعرے لگے اور اس کے گوش زد ہوئے دیکھا تو ایک جلوس نمودار ہوگیا طرح طرح کے پرچموں اور بینروں سے لیس جلوس کسی سیلاب کی طرح اچانک ایک موڑ سے اُمڈ پڑا اور اسے ادھر ادھر جانے کا موقع نہ مل سکا نتیجتاً جلوس کے ساتھ ساتھ اسے چلنا پڑا مضبوط رگ اور پٹھوں کے تنے ہوئے ہاتھوں میں بینر اور جھنڈے تھے بینروں پہ مزدوروں کے حق میں اور تاجروں کے خلاف نعرے لکھے ہوئے تھے ملوں کی انتظامیہ کے خلاف، نفع خوروں کے خلاف، اور دنیا کے ان گنت سیاہ ہاتھوں کے خلاف جو مزدوروں کا استحصال کر رہے تھے نعرے لکھے ہوئے تھے۔ وہ چہرے جو نظر میں آتے تھے مگر مزدور ان نظر نہ آتے

والے چہروں کے مکروفریب سے آگاہ تھے انہیں سالہا سال سے جانتے پہچانتے اور برتتے چلے آرہے تھے وہ قدم سے قدم اور شانوں سے شانے ملا کر چل رہے تھے وہ ایک ساتھ نعرے بلند کر رہے تھے آواز سے آواز ملا کر ان کی اجتماعی طاقت میں ایک ہی جوش ایک ہی ولولہ اور ایک ہی دھڑکن تھی اور سچ ہے کہ اس کے نہیب اور دبدبے سے استحصال کنندہ لرزہ بر اندام تھا اسے اس اجتماعی طاقت کا بالکل صحیح اندازہ تھا۔ اور وہ ہمیشہ سے اس اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کے ہتھکنڈے اختیار کرتا آرہا تھا یہ جلوس نہ جانے کتنی دور سے چل کر آرہا تھا اور کتنی ہی دور اسے ابھی جانا تھا اسے کچھ خبر نہیں تھی مگر ایک چوراہے کے آتے ہی جلوس کا اچانک راستہ بدل گیا تو اس نے سکون کی سانس لی کہ اس ہجوم میں سانس لینا بھی دوبھر تھا عزم و ہمت کے ان پیکروں میں بلا کی طاقت تھی کہ ان کے قدم سے قدم ملا کر چلنا دشوار ہو گیا تھا اور وہ اس ہجوم سے نکل بھاگنے کے طریقوں پہ غور کر رہا تھا کہ اس چوراہے نے اس کی مشکل آسان کر دی مگر اس سارے ہنگامے میں روشنی کا وہ ہالہ جو اس کے دل پر مرتکز تھا کہیں غائب ہو گیا اس پہ تو وہ بہت سٹپٹایا کہ یا اللہ یہ کیا بات ہے روشنی کوئی ایسی کرن تو نہ تھی جسے کسی جیب کترے نے صاف کر دیا ہو مگر جب ایک پارک کے بنچ پہ بیٹھ کر ذرا غور سے اپنے اندر توجہ کی تو رفتہ رفتہ روشنی واپس آگئی یہ بھی عجیب بات ہوئی کہ اس ہجوم سے روشنی بھاگ گئی اور ذرا سی توجہ سے دوبارہ پیدا ہو گئی تو سوچنے لگا کہیں ایسا تو نہیں کہ روشنی اس ہجوم میں کہیں گم ہو گئی تھی۔ معاً اسے خیال آیا کہ روشنی گم وم نہیں ہوئی تھی مزدوروں کی طرف جو اس کی توجہ جذب ہوئی تو گویا دل سے توجہ ہٹ گئی اور وہ سمجھا کہ روشنی غائب ہو گئی، شاید روشنی کو پا کر اس کی حالت اس کنجوس کی سی ہو گئی تھی جو اپنی دولت کو ذرا سی دیر کے لئے بھی نگاہ سے اوجھل نہیں ہونے دیتا وہ تو اس روشنی کی انگلی تھام کر کراچی سے لاہور پہنچ گیا تھا اور روشنی کے

اس طلسم میں پوری طرح جکڑا ہوا تھا روشنی نے اس کو مسحور مبہوت کر کے رکھ دیا تھا
اس کی بنچ کے قریب ہی دو آدمی باتیں کر رہے تھے ایک کہہ رہا تھا۔

"کوئی مزدور خوشی سے ہڑتال نہیں کرتا جب پانی سر سے اونچا ہو جاتا ہے۔
تب وہ فیکٹری کے باہر نکلتا ہے"۔ ـــــ

"مگر فیکٹری کی انتظامیہ نے تمہارے ساتھ تو برا سلوک نہیں کیا"۔ ـــــ

"برا سلوک، اور اس سے زیادہ برا سلوک کیا ہوگا کہ ہمارے ساتھیوں کی چھانٹی
کر دی گئی۔ کتنے لوگوں کو روزگار سے محروم کر دیا گیا۔ صاحب جی، ایک مزدور کی
بیروزگاری کا مطلب ہے پورے ایک کنبے کو روٹی کپڑے اور مکان سے محروم کر دینا
کنبے کے بیماروں کو صحت سے محروم کر دینا، اگر ایک کنبے میں دس آدمی ہیں تو دس
آدمیوں کو آپ کتنی چیزوں سے محروم کر رہے ہیں اور بابوجی آپ نے کتنے مزدوروں کو
نکال دیا پورے ایک سو بیس [۱۲۰]، ایک سو بیس [۱۲۰] کا مطلب یہ ہوا کہ پورے بارہ سو لوگ
بے کار، بے روزگار اور فاقوں سے مرنے کے لئے تیار ہو جائیں اسے کون انصاف
کہے گا؟" ـــــ

"نگران کی نوکریاں کچی تھیں ذرا سوچو قانون بھی تو کچھ ہوتا ہے آخر"۔ ـــــ

"تو ان کو پکا بنا دیتے۔ یہی تو یونین کہہ رہی تھی، سیدھا سا حل تھا"۔ ـــــ

"اس کا مطلب یہ ہے کہ تم صلح کے لئے تیار نہیں ہو"۔ ـــــ

"صاحب جی صلح یہی ہے کہ چھانٹی کا نوٹس واپس لے لیں، وہ مزدوری پر واپس آ
جائیں، ہم فیکٹری میں واپس آ کر کام سنبھال لیں، چلو چھٹی ہوئی ـــــ"

"یہ حل ہم کو قبول نہیں ہے ہمارا کام سمجھانا تھا، سمجھا دیا سوچ لو کہیں ایسا نہ ہو
کہ ابھی ایک سو بیس [۱۲۰] کا رونا رو رہے ہو۔ پھر دو سو چالیس [۲۴۰] پر اگر مصیبت پڑ جائے تو؟"
"یہ آپ دھمکی دے رہے ہیں"؟؟ ـــــ

"نہیں میں سمجھا رہا ہوں، نرمی سے محبت، پیار سے"______

"اچھا پیار ہے کہ آپ نرمی سے کہیں کہ میں تم کو گولی مار رہا ہوں، بڑے پیار سے اور خبردار تم کچھ نہ کہو، کیونکہ یہ پیار ہے، محبت ہے بس آنکھیں بند کرلو اور خاموشی سے مر جاؤ"

"تو تم نہیں مانو گے؟"______

"صاحب، یہ میرا ذاتی معاملہ نہیں ہے"______

"مگر تم یونین کے سیکرٹری ہو، مزدور تمہاری بات نہیں ٹالتے"______

"اسی لیے تو میں ان کو دھوکا نہیں دے سکتا"______

"تو یہی تمہارا فیصلہ ہے"______

"صاحب یہ ساری یونین کا فیصلہ ہے"______

"اچھی بات ہے پھر نہ کہنا کہ تم کو پہلے سے بتایا نہیں گیا تھا"______

"ارے صاحب ہم نے بہت سوچ بچار کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے"______

پہلے آدمی نے اسکوٹر اسٹارٹ کیا اور چل دیا۔ دوسرا آدمی جو مزدوروں کا سیکرٹری تھا سگریٹ سلگانے کے لیے ماچس لینے اس کے پاس چلا آیا اس کے ڈریسنگ گاؤن میں جیب تو تھی مگر ماچس نہ تھی۔ لہذا اس نے معذرت کرتے وقت اس کا چہرہ دیکھا تو اس کے عزائم اور قوت ارادی کی بے پناہ روشنی دمک رہی تھی اس کے چہرے پہ حزن و ملال ضرور تھا مگر کمزوری نہ تھی اس سے اس نے کہا______

"کیا یہ شخص فیکٹری کا مالک تھا"______

"مالک نہیں صاحب منیجر تھا مجھے رشوت دیکر خریدنا چاہتا تھا، بزدل کہیں کا"

"تمہارے اتنے ساتھی بیروزگار ہو گئے، اب کیا ہوگا؟"______

"ہو گا کیا صاحب یونین کے ممبر اپنے پیٹ کاٹ کر پوری نہیں تو آدھی ہی سہی، روٹی تو کھلائیں گے نا اپنے بھائیوں کو، یہ لوگ مان گئے تو ٹھیک ہے، نہیں تو باہر چلے

جائیں گے۔ باہر ہماری بہت مانگ ہے۔ وہاں مزدوری بھی زیادہ ہے اور بک بک بھی نہیں ہے"——

" مگر ہزاروں مزدور جو ہر سال باہر چلے جاتے ہیں کیا اس طرح ملک غریب نہیں ہو جاتا"——

" ہو جاتا ہے صاحب، مگر جب روٹی نہ ملے تو آدمی کیا کرے، بیوی بچے، ماں باپ بہن بھائی کو کب تک ننگا بھوکا دیکھتا رہے۔ کون ہے جو خوشی خوشی باہر جاتا ہے کسے اپنے بیوی بچوں، ماں باپ، بھائی بہن، گھربار اور اپنے وطن سے پیار نہیں ہوتا۔ یہ صاحب یہ پیٹ بہت ظالم ہے، بہت ظالم"——

یہ کہہ کر وہ تو ایک طرف کو روانہ ہو گیا—— مگر وہ سوچنے لگا کہ یہ کون تھا جو اس سے ہم کلام تھا۔ جو روشنی اسے اپنے دل کے اندر نظر آرہی ہے کیا یہ وہی تو نہیں جو مجسم ہو کر باہر آگئی ہے اور باہر ہے کہ پھیلتی ہی چلی جارہی ہے۔ نکلتے ہوئے دن کی دھوپ کی طرح——

تو کیا روشنی کا یہ سورج اس کے دل کے افق پر طلوع ہو رہا ہے؟——

Dr. SHARIB RUDAULVI
COLLECTION.

آپ ہمارے کتابی سلسلے کا حصہ بن سکتے
ہیں مزید اس طرح کی شان دار،
مفید اور نایاب کتب کے حصول کے لئے
ہمارے وٹس ایپ گروپ کو جوائن کریں

ایڈمن پینل

عبداللہ عتیق : 03478848884
سدرہ طاہر : 03340120123
حسنین سیالوی : 03056406067

انّاللہ

بیچ بازار میں ایک ننگا دھڑنگا کالا کلوٹا گھنا ؤنا سا بچہ کھڑا ہوا رو رہا تھا اس کے ہاتھ میں ایک ٹوٹا پھوٹا مٹی کا پیالہ تھا جس میں دال اور چاول کے بچے کھچے دانوں پہ مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں اس کی ماں قریب ہی کھڑی ہوئی ایک دکان سے بھیک مانگ رہی تھی اس کا ایک ہاتھ گود کے بچے کو دبوچے ہوئے تھا اور بچہ ماں کی ننگی چھاتی چچوڑنے میں مشغول تھا سامنے ہی ایک لمبی سی مرسڈیز کار میں ایک خاتون نہایت نفیس لباس پہنے بیٹھی تھی شوفر ادب سے نگاہیں جھکائے اخبار پڑھ رہا تھا جس کی شہ سرخی کافی دور سے بھی نظر آجاتا تھا لکھا تھا "کوئی تیسری دنیا نہیں ہے صرف دو دنیائیں ہیں" شوفر ان ساری دنیاؤں سے الگ اپنی دنیا میں مگن تھا بھکارن اور اس کے بچے اپنی اپنی دنیا میں گم تھے۔ بازار کے دکاندار اپنی دنیا الگ بنائے بیٹھے تھے۔ گاڑیوں پہ چلنے اور بنگلوں میں رہنے والے رہتے تو اسی دنیا میں تھے لیکن خود کو کسی اور ہی دنیا کا باسی سمجھتے تھے۔ معاً ایک جلوس نمودار ہوا، زندہ باد، مردہ باد کے نعرے لگاتا ہوا پتھر برساتا، بھالے اور خنجر چمکاتا، بندوقوں، رائفلوں اور پستولوں سے ہوائی فائرنگ کرتا ہوا جسے دیکھ کر بازار کی دوکانیں آناً فاناً بند ہو گئیں ہجوم میں بھگدڑ مچ گئی کاریں کھٹا کھٹ اسٹارٹ ہوئیں اور فراٹے بھرتی گزر گئیں بھکارن ہکا بکا کھڑی سب کچھ دیکھتی رہ گئی۔ اس کے گود کے بچے نے اس کی چھاتی چچوڑنا چھوڑ دی۔ روتے ہوئے بچے نے اس جلوس کے ہنگامے پہ

خوشی سے تالیاں بجائیں. جلوس گزر گیا اس کے پیچھے پیچھے پولیس کی گاڑیاں بھی گذر گئیں رفتہ رفتہ دبکے دبکائے لوگ ادھر ادھر سے برآمد ہونے لگے آہستہ آہستہ بازار کی دکانیں کھلنے لگیں اور دیکھتے ہی دیکھتے پھر سے ایک بار وہی رونق واپس آگئی۔ بھکارن اب بھی دوکان دوکان اور دروازے دروازے بھیک مانگتی پھر رہی تھی، سارے لوگ سراسیمہ، حیران اور پریشان سے گھوم رہے تھے، بوجھ اور فکر کے خطوط ان کے چہروں سے عیاں تھے، کسی نے کہا: ———

"یہ کیا ہو رہا ہے"؟ ———

دوسرے نے کہا: "ہم کدھر جا رہے ہیں؟" ———

تیسرے نے کہا: "خدا خیر کرے، ہم کو اپنے نفع اور نقصان کا بھی ہوش نہیں"

چوتھا بولا: "دنیا ہم پر ہنستی ہے کہ ہم آخر کس قسم کی قوم ہیں" ———

ایک بولا: "اجی سچ پوچھیئے تو ہم ابھی تک قوم ہی نہیں بن سکے" ———

ایک بزرگ ہانپتے کانپتے آئے ایک حلوائی کی دوکان کے سامنے پڑی بنچ پہ ڈھیر ہو گئے لوگ ان کے گرد جمع ہو گئے انہوں نے حلوائی سے کہا۔ "چھیتی پُتر مینوں اک گلاس لسی دا پھڑا دئیں" ———

کسی نے پوچھا "خیر تو ہے بزرگاں" ———

بزرگ موصوف بولے۔ "کی دساں پُتر، بھرا بھرا نال خون دی ہولی کھیلدا ہے ملیں منع کیتا سی۔ وہ مینوں چُھرا مارنے دوڑا" ———

کسی نے پوچھا، "ہرڈیں" ———

بزرگ نے کہا۔ "آہو ہرڈیں" ———

کسی صاحب نے کہا: "یار یہ اسلحہ کہاں سے آرہا ہے ہمارے ملک میں، ضرور یہ فلاں پارٹی کی شرارت ہے" ———

دوسرے نے کہا۔ "نہیں یہ فلاں فلاں پارٹی ہے"۔ اس بات پہ تکرار بڑھی اور دیکھتے ہی دیکھتے اسی وقت دونوں میں لڑائی کی نوبت آگئی چند لوگ بیچ میں آپڑے اور بزرگ بولے۔ "پتر آرام نال گل بات کرو، جھگڑے دی کی لوڑ لے۔ یاراں خدا دے واسطے خدادا خوف کرو"۔ بزرگ نے لڑائی رکوائی تو اب بحث نے دوسرا رخ اختیار کیا، ایک صاحب نے کہا:———

"فلاں ملک کے فلاں فلاں لیڈر نے کہا کہ ہمارا فلاں لیڈر رہبر دیا ہے، اسے کیا حق ہے یہ کہنے کا، ہم تو نہیں کہتے کہ تم کیا ہو، حالانکہ ہم کو خوب پتہ ہے کہ تم کیا ہو"۔

"مگر ہم غریب ملک ہیں، ہم کچھ بھی کہتے رہیں ہماری کون سنتا ہے"۔———

"اسی لیڈر نے جمہوریت کے بارے میں کیا کیا بگھاری ہیں ہمیں پتہ نہیں کہ وہاں فلاں فلاں الیکشن میں کیا ہوا"۔

ایک بولا۔ "ہمیں دوسروں سے مطلب نہیں، ہم کو اپنی خبر لینا چاہیے"۔

"دوسروں کو بھی اپنی خبر لینا چاہیے، ہم سے تعلقات برابری کی سطح پہ رکھنا چاہیئے"۔

"صاحب" ایک بولا، "فلاں فلاں ملک میں اس کے سربراہ کو ہٹایا گیا، فلاں ملک کا اس میں ہاتھ تھا، فلاں کو قتل کرایا۔ اس میں بھی اس کا ہاتھ تھا اور ساری دنیا میں اس قسم کے خونیں واقعات میں اسی ملک کو ملوث پایا جاتا ہے تو کیا یہ خدائی فوج دار ہیں زبان سے رام رام بغل میں چھری"۔———

بزرگ بولے: "پتر ایہ ساڈی کمزوری نال ہوندا پیا اے، تسی ایماندار، مضبوط تے ہوشیار رہو، کسی مائی دے لعل کی مجال اے کہ ساتوں گرم نگاہ نال دیکھ سکے"۔———

دوسرے نے تائید کی: "آہو ایہ چنگی گل اے"۔———

ایک بولا "ہماری مثال ایک خاندان میں بسنے والے افراد کی سی ہے:

"ہاں ہاں اور کیا"۔ ؟ دوسرے نے کہا۔ خاندان میں اختلافات ہوتے ہیں۔ مگر یہ کشت و خون"____

"یہ ہم سے کوئی کرا رہا ہے"، ایک نے کہا۔ "ہم جو بھائی بھائی کے دشمن ہیں ہمیشہ سے نہیں تھے اب کیوں ہو گئے؟"____

ایک نے غور کیا پتہ نہیں کیوں ہو گئے، جانے کیا، بھوگ پڑ گیا، سچ مچ کوئی خفیہ ہاتھ کہیں کام نہ کر رہا ہو؟"____

ایک جوشیلے نوجوان نے کہا: "یہ سامراج ہے! سامراج استحصالی نظام قائم رکھنا چاہتا ہے۔ یہ تیسری دنیا کے خلاف جارحانہ سازش ہے تیسری دنیا جہاں افلاس ہے، بھوک ہے، سامراجی ملکوں کی پر کیپیٹا انکم PERCAPITA INCOME بڑھتی جا رہی ہے تیسری دنیا کے ملکوں کی گھٹتی جا رہی ہے ہمارا مال ان کی منڈیوں میں سستا ہوتا جا رہا ہے ان کا گھٹیا اور معمولی مال ہم مہنگے داموں خریدنے پر مجبور ہیں سامراج یہی نظام قائم رکھنا چاہتا ہے چاہے کتنے ہی ویتنام، کوریا اور روڈیشیا کے المیے جنم لیتے رہیں۔ کتنے ہی فلسطینی آوارۂ وطن رہیں کتنے ہی لبنان ......"

بزرگ نے پھر مداخلت کی "پتر جوش نال نہیں تسی ہوش نال سوچتے دچار دہ کہ ایہہ ساریاں گلاں جو تسی کر دے ہو ان گلاں وچوں ساڈیاں کمزوریاں نظر آوندی ای کہ نہیں، تسی اتحاد نال رہو تو کسی مائی دے لعل ......"

"ایہہ گل اے پتر" ایک دوسرے صاحب نے مداخلت کی۔

اسی وقت بھکارن بحث کرنے والوں کے بیچ آکر بھیک مانگنے لگی، کسی نے ہاتھ اٹھا کر ماتھے پر رکھا اور معذرت کی، کسی نے زبان سے منع کیا اور اسے آگے بڑھ جانے کے لئے کہا تو کسی نے جھڑک دیا ایک نے کہا۔ "یار یہ فقیر بہت بڑھ گئے ہیں پتہ نہیں کہاں سے آ گئے"____

دوسرے نے کہا: "آگئے کیا، آتے ہی جا رہے ہیں"۔

کسی نے اوپر سے چوسا ہوا آم پھینک دیا، بھکارن کے بچے نے دوڑ کر اٹھایا اور چوسنا شروع کر دیا۔ ایک صاحب جو چائے کی دکان پہ بیٹھے تھے اور کسی کتاب میں مستغرق تھے اچانک کھلکھلا کر ہنس پڑے سارے لوگ ان کی طرف متوجہ ہو گئے حتیٰ کہ وہ بھنگی بھی جو جلوس کے پتھروں مکانوں کے ٹوٹے پھوٹے شیشوں، لیمپ پوسٹوں کے کرچی کرچی بلبوں کے کوڑے کو اکٹھا کرنے پہ مامور تھا، کسی نے پوچھا جناب، آپ کیوں ہنسے؟ ان صاحب نے ہنستے ہوئے کہا "شیطان کے شیرے پہ"۔۔۔۔۔

"شیطان کا شیرہ، بھلا کیا بات ہوئی؟"۔۔۔۔۔ کسی نے پوچھا

وہ بولے "جناب فارسی زبان میں ایک حکایت پڑھ رہا تھا کہ ایک اللہ والے بزرگ ہر وقت اللہ کو یاد کرتے رہتے تھے اور ساتھ ہی ساتھ لاحول بھی پڑھا کرتے تھے۔ لاحول سنتے سنتے شیطان تنگ آگیا اور بالآخر ان کے پاس آکر بولا حضرت یہ جو آپ ہر وقت میرے اوپر لعنت ملامت کرتے رہتے ہیں اور ہر ہر کام میں مجھی کو مطعون کرتے ہیں تو یہ اچھا نہیں کرتے ذرا حجرے سے باہر آیئے اور ایک تماشا دیکھیے غرض کہ شیطان بزرگ کو بازار میں لایا"۔۔۔۔۔

ایک صاحب نے لقمہ دیا۔۔۔۔۔ "ایسا ہی بازار ہوگا"۔۔۔۔۔

دوسرے نے کہا:۔۔۔۔۔ سارے بازار ایک ہی جیسے ہوتے ہیں۔

حکایت سنانے والے صاحب بولے: "تو صاحب بازار میں ایک حلوائی کی دکان پہ کڑھاؤ میں شیرہ رکھا تھا شیطان نے اپنی انگلی اس میں ڈبو دی اور پھر دیوار پہ وہی انگلی لگا دی، پھر بزرگ سے بولا، کہ حضرت بس میں اتنا ہی گنہگار ہوں آگے جو کچھ ہوگا اس کی ذمہ داری آپ کی برادری پہ ہے۔ شیرے پہ ایک مکھی آکر بیٹھ

گئی، مکھی پہ چھپکلی جھپٹ پڑی، بنیے کی بلی چھپکلی پہ جھپٹی تو چھپکلی جان بچانے کے لئے اب جو جھپٹی تو حلوائی کے دودھ کے کڑھاؤ میں جا پڑی۔ حلوائی لٹھ لے کر نکل آیا اور بنیے کو گالیاں دینے لگا۔ بنیا بھی لاٹھی لے کر میدان میں آ گیا اور دونوں میں خوب لٹھ چلے اور دونوں خوب زخمی ہوئے"۔ شیطان نے بزرگ سے کہا۔ حضرت آپ نے ملاحظہ کیا، خطا کس کی ہے۔؟"

جوشیلے نوجوان نے کہا: "بس بالکل یہی حال ہے فلاں ملک کا۔ بلکہ ہر سامراجی ملک شیرہ لگا کر الگ ہو جاتا ہے اور ہم کٹتے مرتے رہتے ہیں ہمارے کٹنے مرنے ہی سے ان کی دکان چلتی ہے، اسلحہ بکتا ہے جنگیں ہوتی ہیں، لوگ مرتے ہیں، بیوائیں اور یتیم ملک کے افلاس میں اضافہ کرتے ہیں جوان عورتیں بازاروں میں بکتی ہیں"۔

بھکارن نے بڑے بچے کے ہاتھ سے آم لے کر چھوٹے بچے کو چسایا اور ایک منہ خود بھی مار لیا۔ بچہ رونے لگا تو آم اُسے لوٹا دیا۔ کسی نے کہا:

"آپ اس بھکارن کو جانتے ہیں؟"——

لوگوں نے کہا، "نہیں، کون ہے یہ؟"——

"پچھلے سال واپڈا کے ننگے تاروں کو ٹھیک کرتے ہوئے جو مزدور ہلاک ہو گیا تھا اس کی بیوی ہے"——

"مگر سرکار نے تو پانچ ہزار کا معاوضہ بھی دیا تھا"——

"دیا تھا، مگر مزدور کے باپ نے لے لیا اور بہو بچوں کو نکال دیا"——

"چہ چہ چہ بے چاری"——

"اجی بے چاری کہاں ہے کبھی کبھار دھندا بھی کر لیتی ہے، دیکھتے نہیں ایک بچہ دودھ پی رہا ہے دوسرا پیٹ میں ہے"——

"یہ سب سالے ایسے ہی ہوتے ہیں، مانگنے دو بھیک۔ ان کی یہی سزا ہے"

اتنے میں ایک نوجوان دوڑتا ہوا آیا اور عین بازار میں ڈھیر ہوگیا۔ اس کی پیٹھ میں خنجر پیوست تھا اور خون جاری تھا، ایک شخص اس پہ جھکا تو اس نے کہا "پانی"

سارے لوگ دوڑ پڑے، پانی پلایا گیا۔ جوشیلے نوجوان نے کہا "تمہارا فلاں پارٹی سے تعلق ہے؟"

اس نے نفی میں گردن ہلائی ـــــ

دوسرے شخص نے پوچھا۔ "اچھا تو فلاں سے ہوگا؟" اس نے پھر نفی میں گردن ہلائی، "میرا کسی پارٹی سے کوئی تعلق نہیں"

کسی نے کہا۔ "ہسپتال لے چلو نہیں تو مر جائے گا" ـــــ

جلدی جلدی ٹیکسی لائی گئی۔ ابھی اسے ٹیکسی میں اٹھا کر لٹایا بھی نہ تھا کہ نوجوان کا منکا ڈھل گیا اور آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں

"چہ چہ چہ بیچارہ، پتہ نہیں کون ہے خواہ مخواہ مارا گیا"

بزرگ بولے "ہائے ہائے کیا سوہنا ابھرسی، اللہ معافی دے"

کسی نے کہا "جیبیں ٹٹولو شاید کچھ اتہ پتہ مل جائے"

پرس میں چند نوٹ کچھ کاغذات، ایک لانڈری کی رسید، پاسپورٹ کی رسید اور شناختی کارڈ موجود تھے اسی پتے پہ چند لوگ ٹیکسی میں لاش ڈال کر روانہ ہوگئے باقی لوگ کھڑے افسوس کرتے رہے کہ معاً لوگوں کے کان کھڑے ہوئے کہیں سے پھر شور اٹھا اور نعروں کی آوازیں آنے لگیں ـــــ

گویا ایک بار پھر کسی جلوس کا ہنگامہ اٹھا اور دیکھتے ہی دیکھتے بازار بند ہوگئے لوگ اِدھر اُدھر دبک گئے اور اب یہ دوسرا جلوس بازار سے گزر رہا تھا یہاں بھی وہی زندہ باد، مردہ باد ہو رہا تھا۔ وہی خنجر بھالے بندوقیں رائفلیں اور پستولیں موجود اور خشت باری جاری تھی جوش و خروش کا وہی اگلا سا انداز تھا جلوس نے

بازار میں تھوڑی سی توڑ پھوڑ کی۔ نعرے لگائے اور ایک دکان میں آگ لگائی، کھانے کی چیزیں اٹھا اٹھا کر پھینکیں، جس پہ بھکارن اور اس کے بچے ٹوٹ پڑے۔ جس قدر سمیٹ سکتے تھے سمیٹا۔ جہاں تک کھا سکتے تھے کھایا پیا۔ جلوس کے رخصت ہوتے ہی جیسے ہی دوکانیں کھلیں تو دوکان دار اِدھر اُدھر سے نکل آئے لٹی ہوئی دوکان کے مالک نے جو بھکارن اور اس کے بچوں کو لٹی ہوئی چیزوں پہ جٹا ہوا دیکھا تو آؤ دیکھا نہ تاؤ ایک موٹا سا ڈنڈا لے کر سارا غصہ اسی بھکارن پہ اتار دیا۔ بے چاری بہتیرا چیخی چلائی، شور مچایا کسی نے مطلقاً توجہ نہ کی جب دوکان دار خود ہی مارتے مارتے تھک گیا تو اس نے دیکھا کہ بھکارن کے سارے جسم سے لہو جاری تھا ناک سے منہ سے حتیٰ کہ کانوں سے بھی اور اس کی آنکھیں مندی ہوئی تھیں گود کے بچے نے زور زور سے رونا شروع کر دیا تھا اور بھی سارے لوگ اکٹھا ہو گئے تھے کہ کسی نے قریب آکر اعلان کیا — "مر گئی" ——

دوکان دار گھبرایا مگر سبھوں نے اس کو الگ لے جا کر سمجھایا بجھایا کہ کوئی فکر کی بات نہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا، شام کو دوکان داروں کی یونین نے متفقہ طور پر مرحومہ کی تجہیز و تکفین کا بندوبست کر دیا اور جلسے جلوسوں میں تشدد کی کارروائی کی مذمت کا ایک ریزولیوشن بھی پاس کرا دیا کہ جس کے سبب ایک بے آسرا بیوہ اپنی جان سے گئی اور دو یتیم بچے بے سہارا چھوڑ گئی۔

انا للّٰہ و انا الیہ راجعون

گانٹھ

بیگماں کا قصہ کچھ اس طرح شروع ہوتا ہے کہ غفور کے ساتھ شادی ہوتے ہی وہ اس کے گھر آگئی تھی چھوٹا سا گاؤں تھا اور اس نیچی اونچی زمین کے ٹیلوں پہ جا بجا اگے ہوئے درخت کچے مکانات کھیت نالے راجباہ وغیرہ غفور بھی اپنے کچے مکان میں اکیلا رہتا تھا نہ یاروں دوستوں کا ٹنٹا نہ ماں باپ کا جھگڑا اور نہ ساس نندوں کا قضیہ بس وہ آتے ہی گھر کی مالکن بن گئی اور زندگی کا پہیہ معمول کے مطابق چلنے لگا غفور دن بھر سارے کرتا اور بیگماں گھرداری میں جٹی رہتی اور پھر رات میں دونوں بے سدھ اور دنیا مافیہا فراموش کر کے سو جاتے یہی ان کا عیش تھا اور یہی ان کی جنت۔ اس کہانی میں موڑ اس مقام پہ آیا کہ بیگماں چند روز کے لئے میکے آئی اور جب واپس غفور کے گھر پہنچی تو پڑوس کے گھر میں بڑی چہل پہل دیکھی ایک شوخ ڈھنگ تڑاخ پڑاخ قسم کی نوجوان عورت کو گاؤں کے اچھے بھلے ثقہ لوگوں کا مرکز نگاہ پایا عورت میں بجا لگاوٹ تھی بات بات پہ ہنسنا روٹھنا ادائیں دکھانا یہ اس کا وہ انداز تھا جس پہ شوہر والی عورتیں دھک سے رہ جاتی ہیں اور اپنے شوہروں کو سات سات تہہ خانوں میں چھپاتی پھرتی ہیں اس پہ طرہ یہ کہ عورت بناؤ سنگھار کپڑے لتے کی شوقین صورت شکل کی اچھی رنگ روپ میں چندے آفتاب چندے مہتاب اچھے بھلے بزرگوں نے تہجد گزاری کے وظیفے میں نازنین کی تسبیح پڑھنا شروع کر دی بیگماں نے دیکھا کہ غفور کے تیور بھی بدل رہے ہیں زبان سے کچھ نہیں پہ

نازنین کو دیکھتے ہی حواس باختہ ہو جاتا ہے ایک روز جب وہ پانی بھر کر لوٹی تو دیکھا نازنین اس کے گھر میں کھڑی غفور سے کھڑی ہنس ہنس کر باتیں کر رہی ہے۔ بیگماں کو دیکھتے ہی غفور بوکھلا گیا مگر نازنین پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا تیز خوشبوؤں میں نہائی ہوئی نازنین یہ کہتی ہوئی لوٹ گئی "انگوٹھی اچھی بنانا نگینہ اچھا لگانا" بیگماں نے تیکھی چتونوں سے نازنین کو دیکھا نازنین نے بیگماں کے معصوم اور بے داغ حسن کو حقارت سے دیکھا اور چلی گئی اس دن سچ مچ بیگماں دھک سے رہ گئی کہ اب کیا ہوگا، غفور سچ مچ نازنین پر لہلوٹ ہو رہا تھا جب یہ بات بیگماں نے غفور کو جتائی تو وہ قسمیں کھا کھا کر اپنی محبت کا یقین دلانے لگا گو وقتی طور پر بات رفت وگزشت ہوئی لیکن بیگماں کو دھڑکا لگ گیا کہ کہیں نازنین اس کے گھر میں کوئی نیا گل نہ کھلائے گاؤں بھر کی کنواریاں دل ہی دل میں نازنین کو گالیاں دیتی تھیں سارے گھبرو اس کی اداؤں پر والہ و شیدا ہو رہے تھے شادی شدہ نوجوان عورتیں پہلے تو دبی زبان سے پھر علی الاعلان اسے کوسنے لگیں کہ ان کے مردوں کا کم ہو گیا ہے اور ہر مرد نازنین کو رجھانے کی کوششوں میں لگا ہوا تھا اس کے بارے میں یہ بھی سنا گیا کہ پہلے ہی دو تین مرد اسے طلاق دے چکے تھے مگر جب اس کے چکنے چہرے کالی گھٹا جیسی گھنی لمبی چوٹی بھرے بھرے کولہے اور البیلی مستانی چال بڑی بڑی سرمگیں آنکھیں کی کٹیلی نگاہوں اور سیپ کے چمکتے دانتوں کو لوگ دیکھتے تو ایمان ڈگمگا جاتا اور وہی لوگ جو اس کی تین تین طلاقوں کو سن کر زبان سے لاحول ولاقوۃ الا باللہ کا ورد کرتے تھے دلوں میں سبحان اللہ اور ماشاء اللہ اور جزاک اللہ کا وظیفہ پڑھنے لگتے۔

ایک روز بیگماں نے دیکھا کہ غفور کے ہاتھ میں پھولوں کا گجرا بندھا ہوا ہے گجرے میں موتیے کے پھول گندھے ہوئے ہیں اور غفور کے جسم سے نازنین کی

خوشبوؤں کی باس آ رہی ہے اس وقت اس کے دل کے اندر چٹ سے جیسے کوئی چیز ٹوٹ گئی اس کی زبان سے کچھ نہ نکلا بس وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی غفور نے اس کی دلجوئی کی استفسار بھی کیا لیکن اس محبت میں وہ حرارت اور جوش نہ تھا جو کبھی ہوا کرتا تھا بیگماں کو اور بھی قلق ہوگیا مگر اسی لمحے جیسے ایک اور بیگماں اس کے اندر پیدا ہو گئی جو اسے آئینہ کے سامنے لے کر آئی اور اس کے سراپا کو اسے دکھایا آخر اس میں کیا کمی ہے بڑی بڑی آنکھیں ستواں ناک سانولی رنگت گھنے سیاہ بال تیکھے ابرو بانکی چتون بھرا بھرا گداز جسم، پھر بھی غفور نازنین کی طرف مائل ہو گیا بیگماں کو بھول کر، نظر انداز اس کے حسن اور جوانی کی توہین کر کے ایک منکوحہ بیوی کے مقدس حق پر ڈاکہ ڈالا اور اسے کوئی کچھ نہیں کہتا وہ اگر نازنین سے دوسری شادی بھی کر لے تو بھی کچھ نہ کہے گا شادی کے خیال سے بیگماں کے اندر ایک اور ناگن سی پھڑپھڑائی لہرائی اور انگڑائی لے کر کروٹیں بدلنے لگی اس نے چپکے سے ایک فیصلہ کیا اور نہایت احتیاط سے دل کی پولی پولی مٹی کی تہہ میں دبا کر دفن کر دیا۔ آئینے میں دیکھ دیکھ کر سنگھار کیا، زیورات پہنے عمدہ عمدہ کپڑے پہنے اور موتیے کے پھولوں کے گجرے گوندھ کر بالوں اور ہاتھوں میں پہنے آنگن میں آ کر سیڑھی اٹھائی اور پڑوس کی دیوار پر لگائی جو نازنین کے گھر میں چھت پر جاتی تھی اور عین نازنین کے ایک کمرے میں دروازے تک پہنچتی تھی دیکھتے دیکھتے بیگماں کمرے میں پہنچ گئی۔ اب جب غفور نے آنگن میں آ کر دیکھا تو نازنین کے کمرے سے بیگماں اور نازنین کے قہقہوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔

چند ہی روز گزرے ہوں گے کہ ایک بھرپور چاندنی رات میں غفور بیگماں کے پہلو سے اٹھا اور اس کو سوتا ہوا سمجھ کر سیڑھی لگا کر نازنین کے کمرے میں پہنچ گیا بیگماں بھی نہایت احتیاط سے اسی سیڑھی پر چڑھ کر دھیرے سے کمرے میں

پہنچ گئی اور کچھ دیر بعد سیڑھی سے اتر کر آنگن میں آگئی سیڑھی اتار کر کونے میں رکھ دی اور اپنے ساتھ جو کچھ اوپر سے لیکر آئی تھی اس کی گٹھڑی بنا کر صندوق میں چھپا آئی اور مزے سے لیٹ گئی صبح ہونے سے پہلے ہی نازنین کے گھر میں ایک ہنگامہ ہو گیا اور اس کے سارے گھر والوں کو پتہ چل گیا کہ غفور اور نازنین کے مشتبہ تعلقات ہیں ہنگامہ زیادہ بڑھا تو بیگماں خود نازنین کے گھر گئی اور اس کے ماں باپ سے کہا وہ غفور سے نازنین کی شادی کر دیں وہ نازنین کے ساتھ بہن کی طرح رہے گی اور بدنامی بھی نہ ہو گی چنانچہ شادی ہو گئی اور نازنین اسکے ساتھ گھر آ گئی۔ شادی کی پہلی رات میں صندوق سے وہ گٹھڑی نکالی اور نازنین کی گود میں ڈال دی گٹھڑی کھولی گئی تو نازنین اور غفور اپنے اپنے کپڑے دیکھ کر حیران رہ گئے

بیگماں نازنین پر ضرورت سے زیادہ مہربان رہنے لگی اور غفور کو تھوڑے ہی دنوں میں یہ شبہ ہونے لگا کہ بیگماں اور نازنین تو ایک دوسرے پر جان چھڑکتی ہیں البتہ وہ دونوں کے درمیان میں کوئی غیر شے ہے دونوں کی دونوں جی بھر کر سنگھار کرتیں کپڑے تبدیل کرتیں خوشبوئیں لگاتیں مہندی رچاتیں سرمہ لگاتیں اور گھر بھر میں آپہلی کبھی بھر میں مزہ تو یہ ہے کہ دونوں بیک وقت غفور کے ساتھ لیٹتیں اور ساتھ اٹھتیں اس نرالی چاہت اور سوتیا ڈاہ کے خلاف اتنی بڑی مشترکہ سازش سے غفور تلملا کر رہ گیا دونوں بیویوں سے اس قدر قریب رہتے ہوئے بھی اتنی دور پہنچ گیا تھا۔ کہ کبھی تصور میں نہ لا سکتا تھا جو لوگ اسے خوش قسمت سمجھتے اور اس کی قسمت پر رشک کرتے انہیں وہ کیونکر سمجھاتا کہ کس قدر عذاب میں پڑ گیا ہے اصل میں پدری نظام کی بنیاد مرد نے رکھی تھی اور عورتوں کو آپس میں حسد اور رقابت کی تباہ کن آگ میں جھلسا کر جو استحصالی معاشرہ قائم ہوتا ہے اس میں مرد فائدے میں رہتا ہے بیگماں نے لاشعوری طور پر اس کی دکھتی رگ پر انگلی رکھ دی تھی اور

نازمین کے تعاون سے جو محاذ قائم کیا تھا اس نے غفور کو ہلا کر رکھدیا۔ بیچارہ غفور دیکھتے ہی دیکھتے کھٹیا سے جا لگا اور چند مہینوں میں چٹ پٹ ہو گیا دونوں بیویوں نے نہایت دھوم دھام کے سے سوگ منایا اور فاتحہ خوانی کرائی اصولاً اب دونوں کو علیحدہ ہو کر اپنی اپنی زندگی کی ڈگر پر تنہا سفر اختیار کرنا چاہیئے تھا کیونکہ غفور کی وجود کی گرہ جس سے دونوں بندھی ہوئی تھیں کھل چکی تھی مگر ایسا نہیں ہوا یہ گانٹھ اور بھی مضبوطی سے بندھ گئی دونوں اسی طرح ساتھ رہتیں ساتھ ساتھ سوتیں جاگتیں کھاتی پیتیں، ہنستی بولتیں، گھومتی پھرتیں اگر ایک کا دل کچے بیر کھانے کو چاہتا تو دوسری کا بھی جی چاہتا ایک گدرا امرود پر منہ مارتی تو دوسرا منہ مارنے کے لیئے دوسری کو بڑھا دیتی ایک موتیے کے پھولوں کے گجرے بالوں میں پہنتی تو دوسری بھی پہنتی ایک ریشم کا کالا لاچہ باندھتی تو دوسری بھی باندھتی سارا گاؤں اس گٹھ جوڑ پر حیران تھا لیکن ان دونوں کو کسی کی حیرانی سے ہرگز سروکار نہ تھا۔

ایک بار گاؤں کے ایک گھبرو نے نازمین کو نکاح کی پیش کش کی اس نے ہرگز برا نہ مانا کہا تو صرف یہ کہا کہ میرے ساتھ ساتھ بگیماں سے بھی نکاح کرنا پڑے گا اس طرح کسی منچلے نے بگیماں سے شادی کا ارادہ ظاہر کیا تو اسے بھی یہی جواب ملا کہ نازمین سے بھی نکاح کرنا پڑے گا۔ قریب کے کسی من چلے زمیندار نے جب یہ سنا تو دونوں کو ایک ساتھ نکاح میں لے آیا زمیندار کی اور بھی بیویاں تھیں جو ایک دوسرے کو دیکھنے کی بھی روادار نہ تھیں لیکن نازمین اور بگیماں کا تو باوا آدم ہی نرالا تھا دونوں بڑے چاؤ سے رہنے لگیں ابھی چند مہینے نہیں گذرے تھے کہ زمیندار کی ساری ہیکڑی نکل گئی دونوں کو ایک ساتھ طلاق دے کر اپنا پنڈ چھڑایا دونوں اسی طرح اپنے گاؤں واپس آگئیں جیسے کوئی پکنک منانے گئی ہوں۔

بہت دن گذر گئے کسی نے شادی کا پیغام نہیں بھیجا تھا تو نازمین ایک رات

کسی اجنبی مرد کو ساتھ لگا لائی اور پھر بگیاں اور نازنین نے بہت دنوں تک اسے گاؤں سے باہر نہ جانے دیا کسی روز وہ جان بچا کر بھاگا تو بگیاں کسی اور مشٹنڈے کو پھانس لائی غرضیکہ باری باری دونوں کی دونوں شکار کرتیں اور مل بانٹ کر حصہ بخرا کر لیتیں جس طرح دو بچے ایک پھل توڑ کر ایک ایک منہ مار کر سارا پھل کھا جاتے کچھ اسی طرح دونوں کی دونوں اپنے اپنے شکار کے حصے بخرے کر لیتیں.

برسات کی ایک رات میں ان کے دروازے پر کسی نے دستک دی بارش ہو رہی تھی بگیاں نے دروازہ کھولا تو ایک لمبا تڑنگا آدمی اندر چلا آیا. کوئی شکاری تھا اس کے سارے کپڑے شرابور ہو چکے تھے دونوں نے مل جل کر اس کی خدمت کی اور ساری رات اس کو ایسا سکھ پہنچایا جیسے وہ سہاگ رات کی سیج پر پڑا ہو۔ بگیاں اور نازنین محض اس کی کنیزیں ہوں اجنبی خوبصورت تنومند اور جوان تھا اپنے طور طریقوں سے خاصہ تجربہ کار لگتا تھا. صبح جب بارش تھم گئی اور اجنبی اپنے کپڑے پہن کر بگیاں اور نازنین کو بغلوں میں لئے ہوئے دروازے آیا تو باری باری دونوں کو الوداعی بوسہ دیتے ہوئے بولا "میں تم کو یاد رکھوں گا اور جلد ہی لوٹ آؤں گا پھر وہ گھوڑے پر بیٹھ کر روانہ ہو گیا آج بگیاں اور نازنین نے یہ محسوس کیا کہ وہ ایک دوسرے کے سامنے نگاہ نہیں چار کر پا رہی ہیں جیسے کچھ ایک دوسرے سے چھپا رہی ہیں جیسے کوئی خزانہ ان کو نظر آیا ہو اور وہ اسے ایک دوسرے سے مخفی رکھنے کی سعی میں لگ گئی ہوں، دونوں میں چند روز تک چھوٹی موٹی باتوں پر چھوٹے موٹے اختلافات بھی ہوئے لیکن رفتہ رفتہ یہ دھند چھٹ گئی وقت اور مدت نے اختلاف ختم کر دیا اور دونوں پہلے کی طرح رہنے سہنے لگیں۔

جاڑے کی ایک منجمد بستہ رات میں اسی اجنبی نے پھر دروازے پہ

ڈرنک دی اس مرتبہ اس کے ساتھ شراب بھی تھی اور ایک اجنبی عورت بھی شراب میں اس نے بیگماں اور نازنین دونوں کو بھی شریک کر لیا مگر عورت میں دونوں عورتوں کا کیونکر حصہ ہو سکتا ہے جب دونوں کی موجودگی میں اس نے اپنا حصہ اڑانا چاہا تو بیگماں اور نازنین تلملا کر رہ گئی۔ گئیں

بیگماں بولی " یہ نہیں ہو سکتا "

نازنین نے کہا " ہمارے سامنے ایسی زیادتی نہیں ہوگی "

مرد نے چپکے سے اٹھا اور بیگماں اور نازنین کے پاس آ کر بولا " مگر تم دونوں جو....."

بیگماں بولی " ہم دو نہیں ایک ہیں، اور یہ عورت غیر ہے "

" غیر " مرد بڑبڑایا اور گالی دے کر حرامزادیو تم سب طوائفیں ہو " اور پھر وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ یہ تیسری عورت بھی طوائف ہے میں نے اسے ایک رات کی قیمت دی ہے اور...... تم دونوں کو بھی قیمت ادا کی ہے "

نازنین بولی " یہ ٹھیک ہے " مگر ہم تم سے پیار کرتے ہیں "

" پیار " مرد زوروں سے ہنسا،

طوائف اور پیار۔ سنو بیبیو، تمہارا پیار دیار مجھے سب معلوم ہے میری قیمت ادا کرو اور میرے حکم پہ چلو۔ رات تباہ نہ کرو "

یہ کہہ کر مرد پھر تیسری عورت کی طرف متوجہ ہوا مگر دونوں عورتوں نے مزاحمت کی آخر اسے غصہ آ گیا تو بڑے سے دو چھریاں نکال کر ایک ایک چھری بیگماں اور نازنین کو دیتے ہوئے بولا " اچھا اگر پیار ہے تو تم دونوں ایک دوسرے پہ چھروں سے حملہ کرو اور لڑو مرد میں دونوں کی چاہت کا تماشہ دیکھوں گا "

دونوں نے چھرے ہاتھوں میں لے لئے اور مضبوطی سے پکڑ کر بیتر سے بدل بدل کر دانت کچکچا کچکچا کر ایک دوسرے کو خون آشام نگاہوں سے دیکھا

مرد دور جا بیٹھا اور تیسری عورت کو گود میں بٹھا کر شراب پینے لگا۔ معاً بگیاں اور نازنین بجلی کی سی سرعت سے جھپٹیں اور دونوں نے ایک ساتھ مرد پر حملہ کر دیا دیکھتے دیکھتے اس کی تکہ بوٹی کر ڈالی تیسری عورت یہ خونیں ڈرامہ دیکھ کر سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگی۔

ایک مدت کے بعد گاؤں میں میلہ لگا۔ بڑی ہڑبونگ مچی باجے تاشے بجے بوڑھے جوان بچے بازاروں میں ٹوٹ پڑے خریداروں اور سودے سلف والوں کے ہجوم کو چیرتی پھاڑتی دو بوڑھی عورتیں جو کچھ ہی روز قبل جیل سے عمر قید گزار کر آئی تھیں ایک ٹیلے پر پہنچیں جہاں ایک قبر کا ڈھیر سا رہ گیا تھا اسے جھاڑ بہا کر صاف کر کے اپنے سروں سے ڈوپٹے اتار کر اور دونوں میں گانٹھ باندھ کر ایک بانس میں باندھا اور اسے مزار پہ آویزاں کر دیا۔ لوگوں نے دیکھا کہ دو بوڑھی ملنگنیاں دھمال ڈال کر رقص کر رہی ہیں گاؤں میں بچے بوڑھے اور جوان جمع ہو کر تماشہ دیکھنے لگے کسی نے کچھ کہا کسی نے کچھ ایک تیسری بوڑھی عورت نے زار و قطار روتے ہوئے ایک جوان عورت سے کہا۔" یہ ایک بزرگ کا مزار ہے وہ دیکھو اس جھنڈے میں گانٹھ لگی ہے بی بی تم بھی منت مان لو، گانٹھ لگا لو، مراد پوری ہوگی"۔ دونوں ملنگنیوں نے تیسری عورت کو دیکھا، اور تیسری عورت نے ان دونوں کو دیکھا۔ تینوں کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

قرض

آج سے کوئی چالیس سال پہلے بھی میں اس وادی میں آیا تھا اس وقت بھی
یہ اتنی ہی خوبصورت تھی چاروں طرف پہاڑوں کا حصار، ان پہ جمی ہوئی سپید سپید
برف، پس منظر میں نیلا نیلا صاف و شفاف آسمان، پہاڑی درختوں کی سر بفلک
پھنگیاں جا بجا بنے ہوئے کچے پکے مکانات، آبشار، جھرنے جھیلیں اور پہاڑوں
کے اندر سے نکلنے والے راستے کٹھ اڑے اور غار ان بستیوں میں رہنے والے
غریب کسان، گلے بان چھوٹی موٹی مزدوری کر کے پیٹ پالنے والے معصوم لوگ جو
صدیوں سے اسی وادی میں پیدا ہوتے پلتے بڑھتے پروان چڑھتے جوان ہوتے عشق
کرتے شادیاں کرتے بچے پیدا کرتے محنت و مشقت سے زندگی تیر کرتے بچوں کی
پرورش کرتے ادھیڑ ہوتے بوڑھے ہوتے مرتے کھپتے اور پھر پیدا ہوتے چلے آ
رہے تھے یعنی زندگی کا یہ قافلہ پیہم رواں دواں تھا اور اس کے معمول میں کوئی فرق نہیں
آیا تھا جا بجا کھیت کھلیانوں کو سیراب کرنے کے لئے چشمے جھیلیں آبشار و نہریں رجباہ
کام میں آتے، ناشپاتی اور سیب، آڑو شفتالو، بادام اور اخروٹ کے باغات
سے ساری وادی پٹی پڑی تھی اسی وادی کا فرزند تھا دلاور خان، جو گھوڑوں کی
تجارت کرتے کرتے آس پاس کے گاؤں سے نکل کر دور دراز کے علاقوں تک،
پہنچ جاتا تھا قریب ہی کے کسی گاؤں میں کسی خاندانی دشمنی کے سبب پولیس نے اسے
خونریزی کے الزام میں گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا تھا قصہ صرف اتنا تھا کہ دلاور خان

گھوڑے بیچ کر گاؤں واپس جا کر اپنی منگیتر سے شادی کرنا چاہتا تھا مگر اس کے ایک
عزیز نے پولیس سے مل کر چوری کے الزام میں اسے گرفتار کرا دیا اور خود اس کی منگیتر
سے شادی کر لی جیل سے چھوٹ کر دلاور خاں سیدھا اپنے عزیز کے گھر پہنچا اور دن
دہاڑے بیسیوں آدمیوں کی موجودگی میں اسے قتل کر دیا چنانچہ اسی وقت سے اسے
روپوش ہونا پڑا پھر وہ جا بجا چھوٹی موٹی وارداتیں کرتا پھرتا تاکہ پیٹ کا دھندہ چلتا
رہے پولیس نے دلاور خان کو ڈاکو کی حیثیت دیکر اس کے سر کی دس ہزار قیمت مقرر کرا
دی تھی اور اس طرح دلاور خاں باقاعدہ اشتہاری ڈاکو مشہور ہو گیا۔

لیکن درحقیقت وہ ایک معصوم اور شریف النفس آدمی تھا ڈاکو وہ تھا نہیں، پولیس
کے غلط طریق کار اور کمزور طرز عمل نے بنا دیا اور وہ بن گیا میرا گاؤں اسی گاؤں سے
متصل واقع تھا دلاور خاں سے میرا گھوڑوں کی تجارت کے سلسلے میں ربط قائم ہوا تھا
جو رفتہ رفتہ دوستی میں بدل گیا ہمارا مشترکہ شوق شکار تھا جب بھی دلاور خاں میرے
گاؤں آتا میں اسے اپنے ہمراہ لیکر شکار پر ضرور جاتا وہ اچھا نشانے باز تھا پھر اس میں
ایک صفت یہ بھی تھی کہ میلوں پیدل چلتا جائے گا نہ تھکے گا اور نہ شکار نہ ملنے
سے مضطرب ہوگا نہ بھوک پیاس کا شکوہ کرے گا بلکہ اچھے اچھے لطیفے چٹکلے قصے کہانیاں سناتا
جائے گا کہ آدمی مطلقاً تکان نہ محسوس کرے اس کے ساتھ میں پہلے پہل جب اس کے
گاؤں میں آیا تھا تو اس کے قدرتی حسن کا گرویدہ ہو گیا۔ دلاور خاں مجھے ساری وادی
میں اس طرح لئے پھرتا رہا جیسے کوئی معزز آدمی اپنے مہمان کو اپنی محل سرا، اس کے
باغات، کمرے، دالان، شہ نشین اور تہہ خانے دکھاتا پھرتا ہے اور داد طلب ہوتا
ہے، دلاور خاں نے اپنی بوڑھی ماں سے مجھے ملایا تھا "یہ میرا سچا یار ہے ماں"۔
اور اس کی ماں نے اپنے جھریوں بھرے ہاتھ سے میرا سر سہلا کر پیشانی کو بوسہ دیا
تھا پھر ایک ناشپاتی کے باغ میں قلانچیں بھرتی ہوئی ہرنوں جیسی وحشی آنکھوں والی

ریشماں سے بھی ملاقات کرائی تھی جو اس کی منگیتر تھی اور جس سے شادی کر کے وہ اسی وادی کے پر امن معاشرے میں کھو جانا چاہتا تھا مگر شہباز خان نے ریشماں کو جھپٹ لیا اور دلاور خان اسے قتل کر کے ڈاکو بن گیا۔

دلاور خان کو اچھا گانا گانا آتا تھا اور اچھے گانے کی وہ قدر بھی کرتا تھا۔ سُر تال لے اور راگ راگنی سے بھی اسے لگاؤ تھا مگر واجبی سا۔ بس دل بہلانے کی حد تک وہ شعری نثر میں گفتگو کرتا تھا۔ لگاتار ایسے فقرے بولتا چلا جاتا جو شعر ہوتے اور اسے خبر بھی نہ ہوتی کہ وہ کیا کر رہا ہے اصل میں وہ جذبات و احساسات کی زبان میں گفتگو کرتا تھا جس میں اس کے ارادے کو مطلقاً دخل نہ ہوتا تھا شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ قدرتی ماحول نے اسے ایسا بنا دیا تھا پھر ریشماں کے عشق میں شعر خود بخود اس کی زبان سے ابلتا تھا اور جذبات کے تموج میں بہتا کبھی کبھار کسی گنگناتے چشمے کے کنارے بیٹھ کر وہ بانسری بجاتا اور بجاتا ہی چلا جاتا سننے والے مبہوت رہ جاتے بانسری میں وہ دل کی گہرائیوں سے سُر نکال کر ڈال تھا اور ساری وادی کو مسحور کر لیتا تھا۔

دلاور خاں اپنی روپوشی کے زمانے میں راتوں رات چھپتا چھپاتا آتا اور چند گھنٹے گزار کر چلا جاتا کبھی کبھار تو وہ مالا مال ہوتا اور کبھی پھوٹی کوڑی کو بھی محتاج ہوتا مگر مجھ سے ہرگز کسی قسم کا مطالبہ نہ کرتا مالا مال ہوتا تو غریبوں کو سب کچھ بانٹ لوٹ کر ہاتھ جھاڑ کر اٹھ بیٹھتا اور محتاج ہوتا تو کسی حرام خور دولت مند کو تاکتا، ہمیشہ تن تنہا واردات کرتا اور غائب ہو جاتا دلاور خان نے جتنی وارداتیں کیں کبھی کسی کو زخمی تک نہ کیا اور ہمیشہ اپنا نام بتا دیا تاکہ دوسروں پر شبہ تک نہ کیا جا سکے بس شہباز خان کا اس نے قتل نہ کیا ہوتا تو وہ ہرگز اشتہاری ڈاکو نہ بنتا جس کا مجھے افسوس تھا۔

میرے ایک دوست نے پولیس کے محکمے میں ایک اعلیٰ افسر کی حیثیت سے ملازمت کی تو مجھے شکار کی دعوت دی عرصے سے دلاور خان کی روپوشی کے سبب

کوئی ساتھی شکاری نہ ملا تھا لہذا اس دعوت کو غنیمت جان کر میں نے قبول کر لیا۔
اور دور دراز کے شکار پہ نکل گیا پولیس کی معیت میں شکار کا وہ لطف کہاں جو
دلاور خان کے ساتھ میسر تھا لیکن گندم اگر بہم نہ رسد۔۔۔۔ الخ۔۔۔ والا معاملہ تھا
مجھ کو غنیمت سمجھ کر شکار پہ چلا گیا تو جی بھر کر خوار ہوا نہ شکار ملا اور نہ شکار کا لطف آیا پھر
اس پر طرہ یہ ہوا کہ دوست کسی خفیہ مشن پہ اچانک روانہ ہو گیا اور مجھے منتظر رہنے کی
ہدایت دے گیا دو روز کے بعد اچانک آدھی رات میں وہ واپس آیا تو پولیس پوسٹ
میں ایک ہنگامہ بپا ہو گیا کہ بہت بڑے ڈاکو کو گرفتار کیا ہے دس ہزار اس کے سر کے
سرکار نے رکھے ہیں وغیرہ وغیرہ میں فوراً سمجھ گیا کہ وہ دلاور خان کا علاقہ ہے اور وہ گرفتار
ہو چکا ہے جب میں نے اپنے دوست سے جا کر استفسار کیا کہ بھئی یہ آدھی رات کو کیا
ہنگامہ برپا ہے تو وہ خوشی میں نیم پاگل سا ہو رہا تھا اور واردات کی ساری نوعیت بتا
رہا تھا کہ کس طرح یہ معرکہ اس نے سر کیا کہ ایک مغنیہ کے کوٹھے پر دلاور خان کا آنا جانا تھا
سرکاری کارندے کے اشارے پہ مغنیہ کے کوٹھے پہ دلاور خان کو شربت میں بیہوشی
کی دوا ملا کر وہ دی اور پلنگ پہ جیسے ہی وہ بے ہوش ہو کر گرا اسے رسیوں سے جکڑ دیا
گیا پولیس جو پہلے ہی گھات میں تھی وہاں پہنچ گئی دلاور خان کو ہوش آیا تو وہ چارپائی سمیت
اٹھ کھڑا ہوا مجھے سامنے کھڑا ہوا دیکھ کر ہنس دیا اور بولا۔ بس ٹھیک ہے میں گرفتار ہو
چکا ہوں مجھے لے چلو۔" تو تم اسے لے آئے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں ہاں۔ حوالات میں بند ہے۔ لیکن ہے جی دار اس نے اطلاع دی۔
میں نے اپنی گفتگو سے یہ ظاہر نہ ہونے دیا کہ میں اسے جانتا ہوں اجنبی بنا رہا۔
میری موجودگی میں حوالات کی چابیاں میز کی دراز میں رکھی گئیں اور اسی وقت فون آ
گیا افسران اعلیٰ نے میرے دوست کو فوری طلب کیا تھا میرے لئے یہ لمحہ غنیمت
تھا میں نے چابیاں نکالیں اور حوالات پہنچ گیا وہاں اندھیرا تھا سلاخوں کے قریب

جا کر میں نے چپکے چپکے آواز دی "دلاور خان دلاور خان" دلاور خان نے میری آواز پہچان لی سلاخوں کے پاس آ کر میرا نام لیا میں نے تصدیق کی اور تالا کھول دیا میں نے کہا "نکل جاؤ" میں تم کو آزاد کر رہا ہوں ورنہ تمہاری جان کی خیر نہیں"

وہ بولا "میں گرفتار ہو چکا ہوں اور یہ بات میں نے سب کے سامنے مان لی ہے اب میں نہیں جاؤں گا"

میں نے ڈانٹ کر کہا "نکل جاؤ ورنہ تم کو مار مار کر بھگا دوں گا"

وہ بولا "تم میرے یار ہو، مجھے تم پہ ناز ہے۔ مگر میں بھی تو تمہارا یار ہوں، تم سے بے وفائی نہیں کر سکتا۔ میں چلا گیا تو تم بھی مارے جاؤ گے اور میں بدنام بھی ہو جاؤں گا کہ جھوٹا ہوں"

میں نے جب بہت اصرار کیا تو دلاور خان اپنی ہتھکڑیاں اور بیڑیاں کھلوا کر باہر نکل آیا، اور بولا یار میں تو جا رہا ہوں مگر مجھے کچھ حساب چکانا ہے، حساب چکاتے ہی میں لوٹ آؤں گا"

میں نے دھکے دے دے کر اسے نکال دیا اور وہ دیکھتے دیکھتے رفوچکر ہو گیا اب میں نے ہتھکڑیاں اور بیڑیاں خود پہن لیں حوالات کا تالا لگایا اور چابیاں اچھال کر کمرے کی طرف پھینک دیں۔

صبح ہوتے ہی میرا پولیس افسر دوست لوٹا تو اس کی ٹھوکر سے چابیوں کا گچھا دروازے سے جا ٹکرایا چابیاں اٹھاتے ہی وہ چونکا اور سیدھا حوالات کی سلاخوں کے پاس آکر چلایا "دلاور خان" میں اٹھا اور سلاخوں کے قریب آیا تو مجھے دیکھ کر وہ سمجھا کہ دلاور خان نے کسی نہ کسی طرح مجھے حوالات میں پہنچا دیا ہے اور خود غائب ہو گیا ہے لیکن جب میں نے صحیح صورت حال اسے بتائی تو میرا پولیس افسر دوست چکرا گیا اور اسی وقت وہیں زمین پہ گر کر بیہوش ہو گیا ساری حوالات میں تہلکہ مچ گیا

ابھی وہ لوگ افسران بالا کو صحیح صورت حال سے مطلع کرنے نہ کرنے میں متامل تھے۔ کہ دلاور خان دوڑتا ہوا واپس آن پہنچا اس کی بغل میں ایک بقچی تھی جسے اس نے میز پر پھینکا اور خود کو پولیس کے حوالے کر دیا۔ مجھے اس کا حساب چکانا تھا اس نے خون آلودہ بقچی کی طرف اشارہ کیا، کسی نے بقچی کو کھولا تو اس میں ایک عورت کا سر تھا، لوگ چونک پڑے، کوئی بولا "یہ تو اسی گانے والی کا سر ہے جس کے کوٹھے پر ہم نے دلاور خان کو گرفتار کیا تھا"

دلاور خان حوالات میں داخل ہوتے ہوئے بولا "اب میرے اوپر کسی کا قرض باقی نہیں رہا میں آرام سے مر سکوں گا"

اس واقعے کو مدت گزر گئی دلاور خان کی بھولی بسری یاد کبھی کبھار آجاتی ہے مگر آج ایک غیر مرئی طاقت مجھے اس وادی میں پھر لے آئی ہے پورے چالیس برس کے بعد میں اس وادی میں آیا، قبرستان میں ایک قبر پہ کسی نے تارکول سے موٹا موٹا "دلاور خان" لکھ دیا ہے ایک بڑھیا اس کے قریب بیٹھی ہوئی بھیک مانگتی رہتی ہے یہ وہی بڑھیا ہے جو کبھی دلاور خان کی محبوبہ تھی اور جسے وہ ریشماں کے نام سے پکارتا تھا جو کبھی حسن و رعنائی کا مجسمہ تھی اور آج محض ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر رہ گئی ہے وہ دلاور خان کی قبر پہ مجاور بنی بیٹھی تھی جیسے دونوں محبت کا قرض اتارنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانا چاہتے ہوں۔

بڑا آدمی

میرے سامنے کوئی چالیس بیالیس سال کا ایک ٹانٹھا سا آدمی فوجیوں کی طرح سلام کر کے کھڑا ہو گیا اور بولا "سر آپ نے مجھے پہچانا نہیں" میں نے واقعی اس شخص کو پہچانا نہیں تھا اور دل ہی دل میں خجل ہو رہا تھا۔ کہ تدریس کے شعبے میں رہتے ہوئے آدمی کا حافظہ آخر اس قدر بیکار کیوں ہو جاتا ہے کہ نام اور چہرے تک ذہن سے یکسر محو ہو جاتے ہیں میں نے نفی میں سر ہلایا تو آنے والا ہنس دیا" سر میں غلام حسین ہوں، آپ کا پرانا ملازم ... آج سے کوئی بیس بائیس برس پہلے آپ کے پاس تھا یاد کیجئے" ذہن پر زور ڈالا تو یاد آنے لگا کہ پنجاب کے ایک ملک زادے کے ہمراہ ایک نوجوان ملازم آیا تھا جو کالج کی اقامت میں اپنے ملک زادے کے ہمراہ رہنے پر اصرار کر رہا تھا اور چونکہ کالج ہوسٹل کے قوانین کے مطابق یہ ممکن نہ تھا لہٰذا اسے کالج میس میں ملازمت دلا دی گئی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ میرے چھوٹے موٹے کام کر دیا کرتا تھا جیسے میس سے کھانا لانا ناشتہ لگانا کپڑوں پہ استری اور جوتوں پہ پالش فرنیچر کی صفائی ستھرائی وغیرہ اس طرح میس سے ملازمین کے کوارٹرز میں اس کے رہنے کا جواز پیدا ہو گیا تھا ملک زادے نے چار چھ سال رہ کر اپنی تعلیم مکمل کی اور چلا گیا۔ اسی طرح غلام حسین بھی آیا اور چلا گیا۔ بات رفت و گذشت ہوئی۔ کہ ہر سال اس طرح نہ جانے کتنے ملازمین آتے جاتے رہتے ہیں ملازمین کی اس ریل پیل میں بھلا کسی غلام حسین کو کوئی کیونکر یاد رکھ سکتا تھا تاہم میں نے اس کی تالیف قلب کے لئے کہا "اچھا اچھا تو تم ہو ... کہاں رہے اتنے دن"؟ اس نے

جواباً ایک بار پھر دانت نکال دیئے، اور بولا "بس سر گیا کہوں کھیتوں پہ کام کرتا رہا۔"

"اچھا اچھا۔ اب کہو کیسے آنا ہوا؟"

"بولا۔ سراب کی پھر ملک زادہ سرور حسین کے ساتھ آیا ہوں، میس میں ڈیوٹی دلادیں۔"

چنانچہ میں نے دوبارہ اسے میس میں ڈیوٹی دلا دی اور غلام حسین پہلے کی طرح کام کاج کرنے لگا اگرچہ اس مرتبہ میرے کاموں میں اس کا انہماک حسب سابق نہ تھا تاہم مجھے کوئی شکایت نہ تھی کہ متبادل انتظامات تیار رہتے تھے۔ مشکل یہ ہوئی کہ میس کے کارپردازوں کو بھی اس سے شکایت رہنے لگی کہ میس میں نہ صرف یہ کہ غلام حسین پوری دلچسپی نہیں لیتا بلکہ اکثر کوتاہیاں بھی کر جاتا ہے میرے سامنے اس کی پیشی ہوئی تو میں نے نرم انداز میں فہمائش کر دی غلام حسین نے کچھ تو اس تنبیہ کے نتیجے میں مستعدی دکھائی اس کے بعد پھر اسی ڈھرے پہ لگ گیا اب شکایات میں اس نوع کے اضافے ہونے لگے کہ غلام حسین زیادہ تر سرور حسین کے کاموں میں لگا رہتا ہے کبھی اس کے کمرے کی صفائی ستھرائی کر رہا ہے کبھی جوتوں پہ پالش، کبھی کپڑوں پہ استری اور کبھی بازار سے دوڑ دوڑ کر سودا سلف لا رہا ہے غرضیکہ وہ میس سے زیادہ شخصی ملازم بن کر رہ گیا تھا جب میس کے کارپردازوں نے متواتر شکایات جاری رکھیں تو سچ مچ میرے کان کھڑے ہو گئے اور مجھے خدشہ ہوا کہ اس طرح ایک غلط مثال قائم ہو گئی تو دوسرے ملازمین پہ بھی اس کا برا اثر پڑے گا، لہٰذا قدرے سختی سے تنبیہ کرنے کی ٹھان کر میں نے غلام حسین کو طلب کر لیا اور کہا۔

"پہلے تو تم ایسے نہیں تھے غلام حسین، یہ اس مرتبہ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ بار بار میس والے تمہاری شکائتیں کر رہے ہیں۔"

"جی وہ" ذرا سا شرمندہ ہوا اور سر کھجانے لگا۔ "بات یہ ہے کہ سر یہ اپنے ملک زادے ہیں نا، انہیں گودوں میں کھلایا ہے میں نے۔"

ٹھیک ہے میں نے کہا۔ تم ملک زادے کا بھی کام کرو، لیکن میس والوں کو آئندہ

شکایت نہ ہونے پائے سمجھے؟"

"جی سر سمجھ گیا۔"

"اب تم جا سکتے ہو۔"

"او کے سر تھینک یو سر۔"

اس نے فوجیوں کی طرح سیلوٹ مارا اور یہ جا وہ جا۔

کچھ دنوں تک تو اس نے میس میں تندہی سے کام کیا۔ لیکن پھر وہی مشکل سامنے آئی اس مرتبہ ملک زادہ کچھ بیمار ہو گیا تو اسے کالج کے انتظامی قوانین کے تحت پہلے کالج کی ڈسپنسری میں اور پھر وہاں سے ہسپتال منتقل کر دیا گیا پیٹ میں درد تھا کالج کے آرایم او نے اینڈی سائٹس کے خدشہ کے سبب ایکسرے وغیرہ کی سہولتوں سے فائدہ اٹھانے کے لیے ایسا کیا تھا لیکن غلام حسین نے تو غضب ہی کر دیا میس کے سارے کام کاج تج کر ملک زادے کی پٹی پکڑ لی اور جب تک وہ کلیتہً صحت یاب ہو کر ہاسٹل واپس نہیں آ گیا غلام حسین میس کی ڈیوٹی سے غیر حاضر رہا میس کے ملازمین کی تاریخ میں یہ اپنی نوعیت کا غیر معمولی واقعہ تھا جس کا ہر شخص نے نوٹس لیا تھا اور ہر شخص غلام حسین سے نالاں تھا یہی نہیں دبی دبی زبان سے لوگ میری نرمی اور ڈھیل کا بھی ذکر کرنے لگے تھے میری پچیس سالہ ملازمت کے دوران ایسا کبھی نہیں ہوا تھا اور یوں اپنی کارکردگی پر حرف آتے دیکھ کر میں بھی چوکنا ہوا اور غلام حسین کو بلا کر صاف صاف لفظوں میں اسے برطرف کر دیا۔ مگر کمبخت برا ہو میری فطری نرمی کا کہ پھر آڑے آئی غلام حسین رونے لگا۔ میرے پیروں پہ سر رکھ دیا اور میں پگھل گیا۔ اسے نوکری پہ واپس بلا لیا۔ تاہم یہ پابندی لگا دی کہ وہ ملک زادہ سرور کا کام نہیں کرے گا کوئی متبادل انتظام ہو گا غلام حسین نے میرا یہ حکم سنا تو اس کی رقت اور تسلیم و رضا کے سارے کیفیات جو چہرے پہ پیدا ہوئے تھے یکسر کافور ہو گئے اس کی جگہ خشونت اور باغیانہ نقوش چہرے سے ہویدا

ہونے لگے مجھے اعتراف ہے کہ اس سے پہلے کبھی غلام حسین کو اس انداز میں میں نے نہیں دیکھا تھا سچ پوچھیے تو میں قدرے ڈر گیا۔ اور یوں محسوس کرنے لگا کہ اگر کچھ دیر اور غلام حسین موجود رہتا تو کہیں میرا خون نہ کر بیٹھے لہذا میں نے فوراً اسے رخصت کر دیا۔

مجھے پتہ چلا کہ دوسرے ملازم سے غلام حسین نے کام کاج کا چارج خفیہ طور پر لے لیا ہے البتہ میں کے کام کاج میں پہلے کے مقابلے میں وہ زیادہ مستعد ہو گیا ہے چنانچہ اس مستعدی کے صلے میں میں نے عمداً اس کی اس کوتاہی سے چشم پوشی کی اور قطعاً کوئی تعرض نہ کیا لہذا رفتہ رفتہ علی الاعلان وہ ملک زادے کے کام کاج کرنے لگا اور یہ سمجھا کہ شاید میں اب اپنی بات بھول گیا ہوں میری توجہ بعض ملازمین نے اس طرف دلانا چاہی مگر میں ٹال گیا ٹالنے ہی میں بھلائی تھی ٹالتا نہ تو کیا کرتا۔ تاہم مجھے یہ کرید پڑ گئی کہ ملک زادے کی خدمت میں جو غلام حسین غیر معمولی غلو سے کام لے رہا ہے تو اس کے مستقر میں جاگیرداروں کے روایتی اور خاندانی جھگڑوں کا کوئی شاخسانہ نہ ہو اور غلام حسین کو خصوصیت سے ملک زادے کے تحفظ پہ مامور کیا گیا ہو۔ کیونکہ غلام حسین کا جس علاقے سے تعلق تھا وہاں کے جاگیرداروں میں پشتہا پشت سے علاقائی عصبیتیں نسل در نسل منتقل ہوتی چلی آ رہی تھیں۔ اور تعلیم کی روشنی بھی اس تاریکی کو دور نہ کر سکی تھی ہو سکتا ہے کہ ملک زادے کا کوئی دشمن اسی کالج میں موجود ہو اور مناسب موقع کی تلاش میں لگا ہو، جبھی تو غلام حسین سائے کی طرح ملک زادے کے ساتھ لگا ہوا تھا گویا وہ اس کا محافظ تھا۔

مجھے یہ بھی اطلاع ملی کہ تصویر کا دوسرا رُخ ذرا مختلف ہے یعنی غلام حسین جس بری طرح ملک زادے پہ جان چھڑکتا تھا، صاحبزادے موصوف اتنی ہی شدت سے اس غریب سے بیزار رہتے گالی گفتاری، لعنت ملامت تو رہی ایک طرف کہ ہر وقت اس وظیفے کا ورد موصوف کرتے رہتے ہیں۔ جوتی پیزار مار دھاڑ۔ تھپڑ لاتوں سے کئی

نہیں چوکتے۔ شروع شروع میں جب ایک آدھ بار یہ حادثہ گزرا اور غریب غلام حسین آنکھوں میں آنسو لیے کمرے سے نکلا تو ایک آدھ ملازم نے پوچھا۔ مگر غلام حسین ٹال گیا کبھی کچھ بہانہ کر دیتا تو کبھی کچھ کہ آنکھوں میں مرچیں پڑ گئی ہیں، دھواں آنکھوں میں گھس گیا ہے وغیرہ مگر جب ایک آدھ ملازم کی موجودگی میں صاحبزادے ملک نے غلام حسین پہ ہاتھ چھوڑ دیا تو تمام نوکروں نے متحد ہو کر بات آگے بڑھانی چاہی بگڑتے ہوئے حالات کو بھانپ کر بیچارے غلام حسین کو خود ہی مداخلت کرنا پڑی اور تمام نوکروں کو ٹھنڈا کر کے گویا بہلا پھسلا کر رام کر لیا ویسے یہ بات مجھ تک پہنچ ہی گئی تو میں نے ملک زادے کو طلب کر کے ڈانٹ ڈپٹا۔

"تم اپنے گھر کے اصول یہاں نہیں برت سکتے۔ کیونکہ یہ تمہارا گھر نہیں ہے غلام حسین تمہارا ذاتی ملازم تمہارے اپنے گھر تک ہے یہاں وہ میں کا ملازم ہے آئندہ کوئی ایسی شکایت آئی تو تم کو ہاسٹل سے خارج کر دیا جائے گا!"

اور ملک زادہ میرے سامنے صرف،

"سوری، آئی ایم سو سوری سر، آئی ایم اکسٹریملی سوری سر"

کا وظیفہ پڑھتا رہا۔ غلام حسین کو اس پیشی کا پتہ چلا تو وہ دوڑا ہوا میرے پاس آیا اور بیحد لجاجت سے ہاتھ جوڑ کر بولا۔

" سر ملک زادے کا نام خارج نہ کیجیے گا وہ ابھی بچے ہیں، دیکھیے نا، ان کی عمر ہی کتنی ہے میں نے دودھ پیتے بچے کو جب وہ اتنے سے تھے پالا پوسا ہے، کیا ہوا، جو کبھی ذرا سی گرمی میں ہاتھ چھوڑ بیٹھتے ہیں سر میں نے تو آپ سے کبھی شکایت نہیں کی پلیز سر معاف کر دیجیے گا، مجھے سزا دے لیجیے گا مگر پلیز سر ملک زادہ کو۔۔۔۔"

جب وہ یہ سب کچھ کہہ رہا تھا تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور رقیق القلبی کے سبب اس کی آواز رندھی ہوئی تھی۔

غلام حسین کے چہرے پہ جہاں تمام گوتم بدھ کی سی طمانیت اور کسی جہاں پرش کا سکون
جھبی نظر آتا تھا جب وہ ملک زادہ کی خدمت نہایت دل جمعی سے بجا لا رہا ہوتا، ادھر
کچھ دنوں سے اس کے رویے میں ایک تبدیلی پیدا ہو گئی تھی کہ میری آنکھ بچا کر میرے
گھر کے کام کاج کر دیتا۔ میری بیوی کو رام رکھتا کہ وقت بے وقت سفارش کی ضرورت پڑ جائے
تو وہ اس حربے کو خوبی سے استعمال کر سکے۔ کبھی کہتا "بی بی جی اصلی باسمتی چاول لاؤں
آپ کو، بڑا بڑھیا چاول ہے، جی پیسے کی کیا ضرورت ہے اپنے ملک زادے کے
کھیت میں نا کیا کمی ہے، کوئی فرق نہیں پڑتا بی بی جی، یہ بی بی جی، صاحب کو پتہ نہ چلے مجھے
ان کی آنکھوں سے بہت ڈر لگتا ہے، پلیز بی بی پیسے نہ دیجئے، مجھے بہت دکھ ہو گا!"
کبھی گھی، کبھی گڑ، کبھی کچھ کبھی کچھ، یہ سلسلہ کسی نہ کسی شکل میں چلتا رہتا تھا۔ میں ڈانٹ
ڈپٹ کر پیسے ادا کر دیتا تو غلام حسین کو واقعی دکھ ہوتا۔ پیسے لینے نہ لینے کی بات نہیں
دکھ اسے اس بات کا ہوتا کہ پانسہ اس کے حق میں نہیں پڑتا، ہر بار پلٹ پلٹ جاتا ہے اور
وہ اپنے مہرے اور اپنے داؤں پہ مجھے لانے میں ناکام ہو جاتا ہے۔

ایک روز میں اپنے اسٹڈی روم میں کچھ پڑھ رہا تھا کہ مجھے پینٹری میں کچھ کھسر پھسر
سنائی دی، میں سمجھ گیا کہ غلام حسین آج پھر کچھ نہ کچھ لایا ہے اور میری بیوی کو اپنے چنگ
پر چڑھا رہا ہے۔ یہاں مجھے یہ کہنے دیجئے کہ عام عورتوں کی طرح میری بیوی میں گھرداری
کے سلسلے میں چھوٹی موٹی مدوں میں بچت کر لینے کی چاٹ ہے لہذا اس نے کبھی اس بات
کو پسند نہیں کیا کہ میں نے غلام حسین کو کیوں ہمیشہ ادائیگیاں کر کر دیں۔ شاید میں ایک
آدھ بار چشم پوشی سے کام لے لیتا اور طرح دے جاتا مگر میرے اندر بھی غلام حسین
کے داؤں نہ چلنے دینے کی شدید خواہش پیدا ہو چکی تھی۔ اور یوں کہیے کہ ایک طرح کی
ضد اور کد سی پیدا ہو گئی تھی۔ لہذا ہر ہر محاذ پہ میں نے سنگین پہرہ بٹھا دیا تھا اور غلام حسین
ہر ہر موقع پہ ہزیمت کھا جاتا تھا چنانچہ میں چپکے سے اٹھا اور دبے پاؤں پینٹری کے

دروازے پہ پہنچ گیا میری بیوی نے مجھے دیکھ لیا لیکن میں نے ہونٹوں پہ انگلی رکھ کر اسے چپ رہنے کا اشارہ کر دیا۔ غلام حسین کچی مونگ پھلیاں بورا بھر کر لے آیا تھا۔ اور میری بیوی سے کہہ رہا تھا "ملک زادے کی زمینوں پہ مونگ پھلی بہت پیدا ہوتی ہے اچھی اور مزیدار بھی ہوتی ہے میں نے سوچا لیتا چلوں جاڑا قریب ہے گرما گرم بھاڑ سے بھنوا کر سب کھایا کریں گے تو کیسا مزہ آئے گا۔ بی بی جی اللہ کے واسطے صاحب جی کو خبر نہ ہو، مجھے ان سے بہت ڈر لگتا ہے۔"

بی بی جی تو چپکی رہیں، میں بولا۔ غلام حسین! تو وہ اُچھل پڑا۔ سچ مچ ڈر گیا۔ میں نے اور میری بیوی نے بمشکل ہنسی ضبط کی۔ "یہ تم میرے خلاف کیا سازشیں کرتے رہتے ہو؟"

"سازشیں" وہ زیر لب بڑبڑایا، پھر دونوں ہاتھ جوڑ کر بولا "صاحب جی خدا کے لئے اس معاملے میں آپ نہ بولیں یہ میری طرف سے بچوں کے لئے تحفہ قبول کر لیں۔ بڑی مہربانی ہوگی۔ یہ میں آپ کو نہیں۔ اپنے بچوں کو دے رہا ہوں۔ کیا ان پہ میرا اتنا بھی حق نہیں، صاحب جی آپ نے انکار کیا تو میں اپنا سر پھوڑ لوں گا۔ ہاں کہہ دیا ہے میں نے۔"

"غلام حسین" میں نے کہا، جانتے ہو رشوت اسی طرح دی جاتی ہے۔ تم مجھے کیوں برے راستے پہ لگا رہے ہو؟"

"توبہ توبہ سر" وہ سچ مچ توبہ کرتے ہوئے بولا اور بے تکلفی سے پھسکڑا مار کر زمین کے فرش پہ بیٹھ گیا۔ کندھے سے بندھی ہوئی چادر کی پوٹلی اتار کر زمین پر رکھ دی۔ چادر کی پوٹلی میں کوئی بہت ہی بھر کم سی چیز بندھی ہوئی تھی میری بیوی نے پوچھا۔

"یہ کیا لائے ہو غلام حسین!"

"یہ" اس نے چادر کی گٹھری کھولتے ہوئے جوتے کا ایک بکس نکالا اور اسے کھول کر دو مردانے جوتے جو ابھی نئے نئے بن کر آئے تھے سامنے رکھ دیئے۔ ملک زادہ

نئے جوتوں کے لیے پریشان تھا بی بی، اب اس کے پاس صرف چار جوڑی ہی جوتے رہ گئے ہیں، کالج کا معاملہ ہے۔ لڑکے بالے نئے جوتے کپڑے پہنتے ہیں تو کڑھتا ہوگا میں نے سوچا ایک جوڑ جوتے کا اور آجائے تو اچھا ہے۔

میری بیوی نے اس کے پھٹے جوتوں کو دیکھ کر کہا "یہ تمہارا ملک زادہ بہت کنجوس ہے، تمہارے جوتے پھٹ گئے اور پاؤں پھٹے جوتوں سے باہر نکلے پڑے رہتے ہیں پر اسے تم پہ ذرا ترس نہیں آتا"

"نہیں بی بی نہیں" وہ بولا۔ "وہ تو بیچارہ بہت کہتے ہے کہ غلام حسین تیرا دل جوتے چاہے لے لے۔ یہ بی بی میں خود نہیں لیتا۔ سر آپ ہی بتائیں۔ اب بھلا میری عمر ہے نئے نئے جوتے پہننے کی"

پھر اس نے نئے جوتوں کو پیار سے دیکھا۔ منہ کے قریب لاکر بھاپ ڈالی اور پھر چادر کے کونے سے صاف کر کے بکس میں بند کر کے کنجی بنالی۔

عید کی چھٹی قریب آرہی تھی، ہوسٹل خالی ہوتے جارہے تھے کہ ایک رات غلام حسین کی ملک زادے نے پھر پٹائی کر دی دیکھنے والے دو ایک نوکروں کا بیان ہے کہ ملک زادے نے کوکا کولا کی پوری بھری بوتل کھینچ کر غلام حسین کے سر پہ دے ماری بیچارے کا سر کھل گیا۔ بہت خون بہا مجھے بتایا گیا کہ ملک زادے نے عید کے موقع پہ کراچی جاکر سیر کرنے کا پروگرام بنایا تھا جس کے لیے دو ہزار روپے طلب کئے تھے غلام حسین نے صرف ایک ہزار روپے لاکر دیئے تھے ملک زادے کا خیال تھا کہ غلام حسین جو اس کے مرحوم والد کی دولت کا متولی بنا بیٹھا تھا۔ اس کی دولت ہتھیا رہا ہے غلام حسین قسمیں کھا کھا کر کہہ رہا تھا کہ ایک ہزار بھی بمشکل وہ لایا ہے غرضیکہ میری بیوی نے فرسٹ ایڈ دیکر غلام حسین کو ہسپتال بھجوایا تو سر میں متعدد ٹانکے لگائے گئے اور جب عید کی چھٹی میں صاحبزادہ اپنے

کسی دوست کے ہمراہ کراچی سدھارے تو غلام حسین راتوں کو ٹہل ٹہل کر تسبیحیں پڑھتا جاتا تھا اور ملک زادے پر قرآن شریف کی سورتیں پڑھ پڑھ کر حصار باندھتا جاتا تھا۔ جب ایک ہفتہ سے زیادہ گزر گیا اور ملک زادے نے پلٹ کر کروٹ نہ بدلی تو غلام حسین نے ٹرنک کال بک کرائی اور کراچی بات کر کے اطمینان حاصل کیا کہ ملک زادہ بخیریت ہے، صرف تفریح میں ذرا دیر ہو گئی۔

واضح رہے کہ ملک زادہ کو متنبہ کیا جا چکا تھا کہ اگر آئندہ اس نے کسی نوکر کو مارا پیٹا تو ہوسٹل سے خارج کر دیا جائے گا چنانچہ کالج کونسل کے سامنے جب کیس پہنچا تو غلام حسین نے صاف بیان دیا کہ اسے کسی نے مارا پیٹا نہیں ہے کوکا کولا کی بوتل اوپر الماری سے اس کے سر پہ آگری، تو سر میں زخم آ گیا جب کونسل کے ممبروں نے غلام حسین کی توجہ اس طرف مبذول کرائی کہ رپورٹ تمہارے صاحب نے کی ہے، تو کیا وہ جھوٹ بولتے ہیں تو غلام حسین نے کہا کہ نہیں صاحب کبھی جھوٹ نہیں بولتے۔ بات یہ ہے کہ کچھ نوکر مجھ سے جلتے ہیں اور وہ صاحب سے الٹی سیدھی باتیں کہا کرتے ہیں غرضیکہ اس مرتبہ بھی غلام حسین نے ملک زادے کو بچا لیا مگر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ ملک زادہ بری صحبت میں پڑ کر شراب کباب کی محفلوں میں شریک ہونے لگا۔ اور ایک رات نشے میں دھت جب وہ ہوسٹل پہنچا تو خدا جانے کیا ہوا کہ غلام حسین کو اس نے اتنا مارا اتنا مارا کہ بیچارہ پرانی روئی کی طرح دھنک کر رہ گیا پورے ہوسٹل کے لڑکے جمع ہو گئے نوکر چاکر اکٹھے ہو گئے مجھے اطلاع ملی تو میں بھی دوڑا ہوا گیا غلام حسین زمین پر بے سدھ پڑا تھا جگہ جگہ سے کھال اور گوشت ادھڑ کر رہ گئے تھے اور خون جاری تھا جلدی جلدی ایمبولینس منگائی گئی اور اسے ہسپتال داخل کیا گیا، کچھ نیک دل طلبہ نے اسے خون بھی ڈونیٹ کیا تاہم دو روز کے بعد اسے ہوش آیا۔

اسی اثناء میں غلام حسین کی بیوی شٹل کارک برقع میں لپٹی لپٹائی میرے

گھر آئی۔ کسی نے اس کو اس کے گاؤں خبر پہنچا دی تھی لیکن یہ نہیں بتایا تھا کہ اصل قصہ کیا ہے صرف اسے یہ پتہ تھا کہ غلام حسین کو ڈاکوؤں نے خوب مارا ہے اور وہ اب ہسپتال میں پڑا ہے غرضیکہ اسے ہسپتال بھجوا دیا گیا۔ پولیس نے جب غلام حسین سے چشم دید گواہوں کے بیان کی تصدیق چاہی تو وہ رونے لگا اور ہاتھ جوڑ جوڑ کر اشارے سے چپ رہنے کو کہنے لگا۔ غلام حسین کی بیوی کے کان میں ملک زادے کے نام کی بھنک پڑ گئی تھی مگر وہ کچھ سمجھ نہ سکی تھی اتفاقیہ میں اور میری بیوی بھی اسی وقت ہسپتال پہنچ گئے اور اپنے ہمراہ ملک زادے کو بھی لیتے گئے تاکہ پولیس کاروائی مکمل ہو سکے پہلے تو ملک زادے کو دیکھ کر غلام حسین کی بیوی صدقے قربان گئی اس کی بلائیں لیں لیکن جب اسے غلام حسین کے زخمی ہونے کی داستان میری بیوی کی زبانی معلوم ہوئی تو وہ غلام حسین کی طرف مڑ کر ہسٹریائی انداز میں چیختی ہوئی بولی "بس بس اب نہیں مجھ سے صبر ہو سکتا۔ نو مہینے پیٹ میں رکھا، دکھ درد سہہ کر جنا ڈھائی سال دودھ پلایا، خون چسایا، تو نے کہا چپ رہ کچھ مت کہنا، میں چپ رہی تو نے کہا ملک زادوں کی طرح اس کی پرورش کرے گا اور ہم دونوں نوکر بن کر رہیں گے میں چپ رہی اٹھارہ سال تک چپ رہی تو نوکر بنا رہا میں نوکرانی بن گئی کہ ہمارا ملک زادہ بڑا آدمی بنے گا، دیکھا اس بڑے آدمی کو۔ تھو ہے ہزار بار تھوکتی ہوں ایسے بڑے آدمی پہ۔ تو ہماری اولاد، ہمارا خون ہماری ہڈی بوٹی اور ہمارے ہی خون کی دشمن" یہ کہہ کر وہ ہتھڑ دل سے ملک زادے کو اس نے مارنا شروع کر دیا غلام حسین جو ہزاروں پٹیوں میں جکڑا ہوا تھا بار بار ہاتھ جوڑ جوڑ کر اپنی بیوی کو بولنے سے منع کرتا رہا لیکن اس نیک بی بی کے منہ سے جوالا مکھی ابل رہا تھا "مجھے اگر معلوم ہوتا کہ تو ایسا نکلے گا تو تجھے جنتے ہی گلا گھونٹ دیتی۔ کمبخت، موذی، مردار، تیرا باپ تو تھا گاؤدی، بیوقوف کہتا تھا کہ ہم نے

اسے اپنی اوقات بنا دی تو پھر وہ بڑا آدمی نہیں بن سکتا۔ وہ کالج میں بڑے بڑے ملک زادوں کے ساتھ پڑھے گا اور پڑھ لکھ کر بڑا افسر بنے گا۔ جب افسر بن جائے گا۔ تو ہم چپکے سے ایک دن بتا دیں گے کہ ہم نے اس کے لیے کیا کیا۔ اے کمبخت میں نے ساری زندگی اسی انتظار میں گزار دی اپنا گہنا پاتا کپڑا لتا سب کچھ بیچ ڈالا مکان زمین ختم کر دیا۔ او لعنت کے بھرے ہم نے اپنی زندگی کا سارا سکھ نچوڑ نچوڑ کر تجھے کھلا دیا پلا دیا۔ کیا اسی دن کے لیے ؟!"

غلام حسین اس سارے ہنگامے میں بار بار اٹھتے اور اپنی بیوی کو روکنے کی سعی کرتا رہا اور بالآخر جب وہ ملک زادے کو پٹنے سے بچانے کے لیے زور لگا کر اٹھا تو لڑکھڑا کر ڈھیر ہو گیا اسی وقت ڈاکٹر کو اطلاع دی گئی۔ وہ دوڑا ہوا آیا۔ چنانچہ اس نے غلام حسین کے دوبارہ بے ہوش ہونے کی تصدیق کر دی۔

کھویا ہوا بچہ

ملک کا وہ سب سے بڑا مصور تھا۔ اس کی تصاویر کی نمائش ہو رہی تھی متعدد تصاویر آویزاں تھیں اور شہر کی بہت بڑی خلقت ٹوٹ پڑی تھی کہ ناہید ایک تصویر کے قریب ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی، "لگتا ہے اس بچے کو کہیں دیکھا ہے"

وہ مسکرایا، اور اپنا پائپ پیتے ہوئے دوسری طرف چلدیا۔ ناہید نے تمام تصاویر کو دیکھنے کے بعد اسی تصویر کے سامنے رک کر پھر وہی بات کہی "یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس بچے کو کہیں دیکھا ہے تمہارا کیا خیال ہے؟"

اس نے مسکرا کہا "شاید"، جب رات ہو گئی اور ساری خلقت رخصت ہو گئی تو ناہید اس کے قریب آکر کھڑی ہو گئی اور کچھ لمحوں کے بعد تیسری بار پھر ناہید نے یہی بات کہی تو وہ سنجیدہ ہو گیا اس کی گھنی اور چھتنار سنہری داڑھی اور مونچھوں کے مابین چمک آگئی اور وہ بولا۔

ہاں ناہید اس تصویر میں جس بچے کو دیکھ رہی ہو وہ ایک کھویا ہوا بچہ ہے، "تم اسے جانتے ہو؟"

اُس نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"شاید بہت قریب سے جانتا ہوں"،

"جب سے یہ کھویا ہے آج تک نہیں ملا"،

"مجھے بھی نہیں ملا جو اسے بہت قریب سے جانتا ہے بہت قریب سے۔۔۔

آؤ تم کو اس کھوئے ہوئے بچے کی کہانی سنائیں؟

سخت دھوپ کی وجہ سے فضا تو اتنی ہوتی تھی، تمازتِ آفتاب اتنی بڑھ گئی تھی کہ سڑکوں کا تارکول رقیق ہو گیا تھا اور جا بجا درختوں کے سائے میں لوگ باگ ٹھہر ٹھہر کر سستاتے یا بس کا انتظار کرتے نظر آتے تھے۔ ہوا میں گرمی کی لہریں آ آ کر مل مل جاتیں تو لُو کا احساس ہوتا، تا بحدِ نگاہ سناٹا تھا سڑک پہ اکا دکا کوئی مسافر نظر آ جاتا تو آ جاتا ورنہ رکشوں ٹیکسیوں، تانگوں، بسوں ویگنوں میں لوگ پناہ لے کر بھاگ کھڑے ہوتے کوئی اس گرمی کے سامنے ٹھہرنے کا نام نہ لیتا تھا مگر حامد کو مطلقاً نہ تو گرمی کا احساس تھا نہ لو اور دھوپ کا، وہ دیر سے بغل میں کتابوں کا پشتارہ دبائے اس راستے کو کھوج رہا تھا جس پہ سے گزر کر اس کی ماں انسانوں کے بے پناہ ہجوم میں اس طرح گم ہو گئی تھی جیسے کوئی حقیر قطرہ سمندر میں جذب ہو جاتا ہے ماں کدھر چلی گئی باپ نے اسے گھر سے نکال کر دوسری شادی کیوں رچائی، دوسری عورت جس کے ہاتھوں میں ہر وقت مہندی رچی رہتی، حامد کو یوں لگتا کہ جیسے اس کی ماں کے خون سے یہ مہندی رچائی گئی ہے یہ سب کیوں ہوا کیسے ہوا اسے کچھ خبر نہ تھی۔

حامد اکثر سڑک کے اس ٹکڑے پر آ کر اس راہ پہ کھڑا ہو جاتا اور آتے جاتے چہروں میں اپنی ماں کا چہرہ تلاش کرتا رہتا اس ہجوم میں جو کبھی کسی انڈسٹریل ہوم سے ابلتا وہ اپنی ماں کے چہرے کو کھوجتا کبھی آتی جاتی بسوں میں چڑھتی اترتی عورتوں میں ماں کو تلاش کرتا مگر ماں کچھ اس طرح گئی تھی کہ سوائے خواب کے کہیں اور نظر نہ آتی۔

اسی ادھیڑ بن میں وہ سکول سے گھر پہنچ جاتا گھر جو اس کے لئے قید خانے سے کم نہ تھا جہاں سوتیلی ماں کی چڑھی ہوئی تیوریاں کھنچے ہوئے ابرو اور نفرت میں ڈوبی ہوئی آواز اس کا خیر مقدم کرتی۔ جہاں وہ کتابیں پھینک کر بستر میں جا کر گر جاتا اور پھر ماں کو یاد کرنے لگتا جب وہ سکول سے لوٹتا تھا تو ماں باورچی خانے میں گھسی ہوئی

کام کاج میں منہمک ہوتی تھی وہ دبے پاؤں جاکر ماں کی آنکھوں پہ ہاتھ رکھ دیتا تھا۔ اور ماں گلے سے لگاکر اس کا ماتھا چوم لیتی تھی اور پھر اچھے سے اچھا کھانا اپنے ہاتھ سے کھلاتی تھی اور یہ سوتیلی ماں اسے دیکھتے ہی آگ بگولہ ہوجاتی تھی ساری دنیا کی نفرت اس کے چہرے سے ابلتی تھی اور باپ ایک ایسی پتنگ کے مانند تھا جس کی ڈور اب سوتیلی ماں کے ہاتھ میں تھی جدھر موڑتی مڑ جاتا جیسے وہ پہلے جیسی شفقت اور محبت کسی نے اچانک اسکے دل سے نکال دی تھی کبھی کبھی تو اس باپ کے چہرے میں وہ کسی اجنبی آدمی کے نقوش دیکھ کر حیران رہ جاتا گویا باپ نہیں تھا نیدار بن کر رہ گیا تھا جس کے ہاتھ میں ڈرانٹ ڈپٹ کا ڈنڈا دیدیا گیا تھا۔

حامد اکثر رونے لگتا مگر پھر آنسو پونچھ ڈالتا اس کی ماں نے کہا تھا مرد رویا نہیں کرتے وہ آئینے کے سامنے جاکھڑا ہوتا اور تصوّر ہی تصوّر میں دیکھتا کہ جیسے اس کا قد کھینچ کر اتنا لمبا ہوگیا ہے کہ باپ سے ہاتھ بھر اونچا، مونچھیں نکل آئی ہیں اور وہ ایک ایسا مرد بن گیا ہے جس کی ہیبت سے اس کا باپ لرزہ براندام ہے سوتیلی ماں تھر تھر کانپ رہی ہے اور ہاتھ جوڑ کر اس کے قدموں میں گر گئی ہے اور اس کے ہاتھ میں کوڑا ہے جسے وہ زمین پہ بار بار پٹخ رہا ہے سوتیلی ماں رو رو کر کہہ رہی ہے کہ میں تمہاری باندی ہوں، تمہاری ماں کی کنیز ہوں خدا کے لئے مجھے معاف کردو اس تصوّر ہی سے اس کی مٹھیاں بھنچ جاتیں آنکھیں سرخ ہوجاتیں ابرو تن جاتے اور وہ زوروں سے زمین پہ پاؤں پٹخ پٹخ کر کہتا، میرا نام حامد ہے، میں حامد ہوں، ایک بار تو اسی حالت میں اس کی سوتیلی ماں نے اسے دیکھ لیا اور اس کے باپ سے اس کی شکایت جڑ دی باپ نے نہ دیکھا آؤ نہ دیکھا تاؤ اور ڈنڈا لے کر جٹ گیا خوب مرمت کی بڑا آیا ہے، لاٹ صاحب کا بچہ، اپنے ماں پہ سکے تانتا ہے تیری تو ہڈی پسلی توڑ دوں گا حرام زادہ کہیں کا۔

اسی رات حامد گھر سے نکل گیا۔

اپنے باپ اور سوتیلی ماں کے خلاف اس کے اندر نفرت کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا وہ جسم کے درد کو بھول گیا اسے یہ محسوس ہوا کہ درد اس کے دل میں ہے جیسے سب کچھ ٹوٹ پھوٹ گیا ہے جیسے کائنات کا سارا حسن ساری خوبیاں ختم ہو گئی ہیں اور ہر طرف سوتیلی ماؤں کی نفرت بھری آنکھیں ہیں اور ہر باپ کے ہاتھ میں ڈنڈا ہے۔

رات سائیں سائیں کر رہی تھی سڑک ویران تھی قطار اندر قطار بجلی کے کھمبوں کے بلب یوں روشن تھے جیسے ایک زنجیر میں پروئے ہوئے تارے روشن ہوں آسمان پہ گرد کی دھند سی تھی مگر تارے جگنوؤں کی طرح چمک رہے تھے کبھی کبھار کوئی ٹرک دھڑ دھڑاتا ہوا گزر جاتا تو خاموشی درہم برہم ہو جاتی، وہ خود بخود رونے لگا جیسے جیسے ٹریفک بڑھتا جا رہا تھا اس کی آواز بلند ہوتی جا رہی تھی کہ معاً کسی نے اس کے شانے پہ ہاتھ رکھ کر پوچھا "کون ہے تو یہاں کیا کر رہا ہے؟"

مگر اس نے کسی بات کا جواب نہ دیا۔ اسے پولیس سٹیشن پہنچا دیا گیا اور پھر وہاں سے کسی ادارے میں منتقل کر دیا گیا دوسرے روز اس کی بہت سی تصویریں کھینچی گئیں اور ایک دن اخبار میں اپنی بڑی سی تصویر دیکھ کر وہ حیران ہوا نیچے لکھا ہوا تھا "یہ بچہ کس کا ہے؟ اس نے خود بھی سوچا، بہت سوچا کہ وہ بچہ کس کا ہے؟ کیا آسمان سے زمین پہ ٹپکا ہے کسی درخت سے اُگا ہے، کسی کھیت میں پک کر فصل کی طرح تیار ہوا ہے۔ اس ادارے میں ایسے بہت گڈو، پپو، خالد، عارف، ماجد، سلیم وغیرہ تھے، جو گم گشتہ منزل تھے جو ماں باپ کے ہوتے ہوئے بھی بے ماں باپ کے تھے جن کا کوئی پرسان حال نہ تھا، کسی کی ماں گم ہو گئی تھی کسی کا باپ۔

حامد کو ادارے کے سربراہ کے سامنے طلب کیا گیا تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ اس کی ماں وہاں بانہیں پھیلائے اس کی منتظر تھی دونوں ماں بیٹے خوب گلے لگ کر بلک بلک کر روئے ماں نے ساری سچی کہانی سنا دی مگر سربراہ نے کہا کہ بغیر باپ

کی اجازت کے حامد کو وہ ایک عورت کے حوالے نہیں کر سکتے دونوں نے بہت کچھ خوشامد درآمد بھی کی لیکن کچھ پیش نہ گئی قانون بعض اوقات کس قدر بے رحم ہوتا ہے باپ کو ادارے کی طرف سے اطلاع دی گئی کہ بچے کو آ کر لے جائیں، ظالم باپ نے کہلوایا کہ اس کا کوئی بچہ نہیں ہے ادارے نے جواباً اطلاع دی کہ اگر لیا ہے تو بچے کو ماں کے حوالے کر دیا جائے گا چنانچہ ماں باپ اور بچہ سب کے سب عدالت میں اکٹھا ہو گئے ماں نے جذبات سے اپیل کی، عدالت نے مسترد کر دی۔ بچے نے رو رو کر ماں کے پاس چلے جانے کو کہا۔ عدالت نے رد کر دیا، باپ نے کہا کہ اولاد کی تربیت ماں نہیں کر سکتی اس لیے بچے کو باپ کے حوالے کیا جائے اگر بچہ شیر خوار ہوتا تو ماں کی گود میں دینے کا جواز تھا۔ اب ہر قیمت یہ بچہ باپ کو دیا جائے عدالت نے باپ کے حق میں فیصلہ دے دیا، ماں روتی ہوئی ایک طرف چلی گئی بچہ روتا پیٹتا سوتیلی ماں کی قید میں واپس آ گیا۔

وہ رات اس کی قید کی آخری رات تھی۔

اس بار جو وہ گھر سے بھاگا تو سیدھا اسٹیشن آیا، ایک رینگتی ہوئی گاڑی میں جا بیٹھا اور ایک لمبز پہ جا کر گر گیا، ایسا سویا، ایسا سویا کہ سیٹھ ہارون بھائی مامون بھائی کے محل میں جا کر جاگا۔ جہاں اسے سب کچھ مل گیا، مگر آج تک وہ کھویا ہوا بچہ جسے حامد کہتے تھے پھر نہ ملا۔

ناہید نے اس کھوئے ہوئے بچے کے کندھے پہ سر رکھ دیا اور بولی۔

”میں نے اسے پا لیا ہے“

مگر وہ آبدیدہ ہو گیا اور بولا۔

”مگر —— میری ماں، ناہید میری ماں کدھر گئی؟“

”تم ایک تصویر اور بناؤ“

”ہاں میرا بھی یہی جی چاہتا ہے کہ اپنے باپ کی تصویر بناؤں جس کے ایک ہاتھ

تلوار ہو اور دوسرے ہاتھ میں دو پھول ہوں جو وہ اپنی بیوی کو پیش کر رہا ہو ایک پھول میں ایک بچہ ہو، معصوم بچہ، دوسرے میں ایک معصوم بیوی ہو اور کٹی ہوئی شاخ سے لہو کی بوندیں ٹپک رہی ہوں۔!

ناہید نے اس کے شانے کو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"مجھے ڈر لگتا ہے حامد۔ کہیں تم بھی۔ اپنے باپ کی طرح۔۔۔"

حامد نے ناہید کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔

"کھویا ہوا بچہ اپنے بچوں کو زیادہ سنبھال کر رکھ سکتا ہے۔"

اور پھر دونوں ہنستے ہوئے کمرے کے اندر چلے گئے۔

کارواں دل کا

قد، ملاں کا بانس کی طرح لمبا، جسم کھپاچ کی طرح دبلا اور ربید کی طرح لچکدار واقع ہوا تھا، رنگ سیاہ فام تارکول کی طرح چمکدار، چیچک کے داغ سارے چہرے پر پھیلے ہوئے پھکی جیسی ناک، چھوٹی چھوٹی چیال جیسی آنکھیں، بڑے بڑے لمبوترے دانت اور موٹے موٹے ہونٹ رات برات بچے دیکھ لیں تو سچ مچ بھوت پریت سمجھ کر ڈر جائیں۔ عمر بھی ساٹھ کے آس پاس ہوگی آواز ایسی نحیف جیسے کوئی سات کنوؤں کے اندر سے بول رہا ہو اور چلتا یوں تھا کہ جیسے اب گرا کہ جب۔

ملاں میرے بھنگی کا نام ہے جو روزانہ صبح صبح صفائی ستھرائی کے لئے صرف اس لئے آجاتا ہے کہ باورچن سے لڑ جھگڑ کر دو پیالے چائے پی لے بچے کھچے توسٹ کے ٹکڑے اپنے پیٹ کے دوزخ میں بھرے اور اگر رات کا بچا کھچا دال سالن رکھا ہو تو اسے بھی پیٹ کا ایندھن بنالے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس چمرخی جسم میں اتنی چیزیں وہ کیونکہ بھر لیتا ہے اور پھر بھی اس قدر نحیف و نزار ہے کہ دیکھ کر ڈر لگتا ہے کہ کہیں تیز ہوا کا جھونکا اسے تنکے کی طرح اڑا کر نہ لے جائے میں نے جب بھی اس اندیشے کا اظہار کیا ہے میری باورچن نے ہمیشہ یہی کہا ہے کہ "صاحب یہ کہیں اڑ کر جانے والے گا نہیں کسی ڈش، پلیٹ یا پیالے میں پڑا رہے گا!"

اصل میں میری باورچن شروع ہی سے ملاں سے جلتی ہے بہت دنوں تک اس کوشش میں لگی رہی کہ اسے کسی طرح چلتا کر دے اور اس کی جگہ اور کسی

پھر نیلے منگی کو نوکر رکھوا دے کہ وہ ترت پٹ اپنا کام کرے اور اپنا رستہ ناپے تاکہ میرے باورچی خانے کے باقیات الصالحات کی وہ بلا شرکت غیرے حقدار بن سکے میری باورچن ہے تو بڑے کلے ٹھلے کی تندرست و توانا عورت جو یہاں آنے سے پہلے متعدد غیر ملکیوں کی گک رہ چکی ہے مگر اب بیوگی کی زندگی جو پہاڑ کی طرح سخت ہے کاٹے نہیں کٹتی، چونکہ اکلوتی لڑکی کے شوہر کے گھر ٹکڑے توڑنا پسند نہیں کرتی تھی اس لئے میرے پاس ملازمت کر رہی ہے، میری ہمیشہ سے یہی مرضی رہی ہے کہ ملاں کو کچھ نہ کہا جائے بلکہ جو کچھ ہو سکے اس کے ساتھ نیک سلوک ضرور کیا جائے لہٰذا طوعاً و کرہاً وہ اسے برداشت کر رہی ہے۔

ملاں کا طریقۂ کار یہ ہے کہ بنگلے کا گیٹ کھلتے ہی فوراً گھر میں نازل ہو جاتا ہے۔ باورچن کا خیال ہے کہ وہ گیٹ سے لگا ہوا سو رہا ہوتا ہے جیسے ہی دودھ والا آتا ہے تو ملاں آوازیں دے دے کر اور چیخ چیخ کر بیرونی میں سوئی ہوئی باورچن کو جگاتا ہے اور اور اخبار لئے ہوئے سیدھا میرے کمرے میں آتا ہے، اگر جاگ رہا ہوں تو نہایت ادب سے مگر خوشامدانہ انداز میں، "گڈ مارننگ" کہہ کر اپنے بانس جیسے قد کو رکوع کی حد تک جھکاتا ہے اور پچھلے قدموں چلتا ہوا کمرے کے باہر چلا جاتا ہے اور اخبار سائڈ ٹیبل پر رکھ دیتا ہے اگر میں سو رہا ہوں تو آواز پیدا کئے بغیر اخبار میز پر رکھ کر چلا جاتا ہے کبھی کبھار جب میں برآمدے میں پڑی ہوئی آرام کرسی پر نیم دراز حالت میں پڑا ہوا ہوتا ہوں تو قریب آ کر زمین پہ بیٹھ جاتا ہے اور دھیرے سے کہتا ہے۔

"صاحب، جی، کیا بات ہے؟"

اگر میرے جواب میں ذرا بھی التفات پاتا ہے تو فوراً کوئی نہ کوئی دکھڑا لے کر بیٹھ جاتا ہے کبھی اپنی بستی کا کوئی تازہ واقعہ سناتا ہے تو کبھی سیاست میں ٹانگ اڑانے کے لئے بیٹھ جاتا ہے اس کی سیاست بازی سے کہیں یہ نہ سمجھ لیجئے گا کہ وہ باقاعدہ اخبار

پڑھتا ہے پڑھنے کے نام پر تو وہ الف کے نام بے بھی نہیں جانتا مگر اخباری تصاویر ضرور دیکھتا ہے اور جب دیکھتا ہے تو خوب غور سے دیکھتا ہے اور اپنی سمجھ کے حساب سے رائے بھی ضرور قائم کرتا ہے مثلاً اگر کسی سیاستدان کی تصویر کے آس پاس کسی گوریلے یا بن مانس کی تصویر نظر آجائے تو ملال یہ رائے قائم کرنے میں خود کو حق بجانب سمجھتا ہے. کہ فلاں سیاستدان کا بن مانس سے مقابلہ ہوگا. یا بن مانس نے سیاست دان کو جیت کر دیا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ فلم ایکٹرس کے آس پاس بن مانس کی تصویر بنی ہو تو فوراً یہ نتیجہ اخذ کریگا کہ ایکٹرس آدم زاد کے چنگل سے نکل کر بن مانس کی محبت کی اسیر ہو گئی. یا بن مانس نے ایکٹرس سے اظہار عشق کر دیا. عموماً اسی قسم کی باتوں کا ذکر وہ میری باورچن سے کیا کرتا ہے جو بے حد زچ ہوتی ہے اور ہزاروں لعنتوں کے طوق ہر وقت ملال کے گلے میں ڈالا کرتی ہے حد یہ ہے کہ کبھی کبھار اسی جھاڑو سے اسے مارتی بھی ہے مگر ملال پٹ پٹا کر یوں سیدھا ہو جاتا ہے جیسے کسی نے گرد جھاڑ دی ہو اور پھر اُسے توسٹ مکھن اور پنیر کے بچے کھچے ٹکڑوں کی فرمائش کرنے لگتا ہے.

ملال چھوٹی چھوٹی چوریوں پر یقین رکھتا ہے مثلاً اگر بہت سی ریزگاری پڑی ہے تو سگریٹ بیڑی بھر کے پیسے چن لینا وہ اپنا حق سمجھتا ہے میرے سگریٹ کیس سے کبھی کبھار ایک آدھ سگریٹ اڑا لینا اس کے نزدیک کوئی جرم نہیں ہے مگر اس کے علاوہ آپ ہزار کیا لاکھ روپیہ بھی رکھ دیجئے کیا مجال کہ ملال آنکھ اٹھا کر بھی دیکھ لے اصل میں ملال بہت قناعت پسند واقع ہوا ہے ہزار اور لاکھ کی کوئی گنتی اس کی لغات میں نہیں ہے ایک بار ایک نہائیت پھوہڑ اور بدسلیقہ خاتون میری مہمان بنیں اور اپنی قیمتی سونے کی زنجیر باتھ روم کے ٹب کے پاس رکھ کر بھول گئیں اور سارے گھر کو سر پہ اٹھایا غریب کی جورو سب کی سلہج سمجھ کر بیچارے ملال پہ پھر گئیں اور اسے خوب آڑے ہاتھوں لیا اور اس مبینہ چوری پہ جو جو مظالم

توڑے جا سکتے تھے انہوں نے خوب خوب توڑے جب مجھے اس واقعے کی اطلاع ہوئی تو بہت دکھ ہوا، دکھ اس کا نہیں ہوا کہ زنجیر کھو گئی، اس کا ہوا کہ بیچارے ملاں کو ردی کی طرح دھنک کر رکھ دیا گیا تھا جب کہ سونے کی زنجیر کا کوئی مصرف اس کی لغت میں موجود ہی نہ تھا اور جب میں نے ملاں کی وکالت کی اور خاتون سے کہا کہ وہ خود سوچیں کہ وہ کہاں کہاں گئیں اور کیا کیا، کیا تو انہیں نہاتے کا خیال آیا فوراً باتھ روم میں گئیں اور زنجیر اٹھا لائیں۔ اس بات کی تو ہماری باورچن بھی قائل ہے کہ ملاں چور نہیں ہے دغا باز ضرور ہے اور اس کی دغا بازی کھانے پینے کی بچی چیزوں ریزگاری کے پیسوں اور چند سگرٹوں تک محدود ہے۔

ملاں کے آگے پیچھے کوئی ہے نہیں، نہ شادی نہ بیاہ نہ عشق نہ محبت، جو رونہ جاتا مشکل یہ ہے کہ اللہ میاں سے بھی کوئی اس کا ناطہ نہ تھا نہ اسے مسجد میں دیکھا نہ اسے مندر میں نہ بدھوں کے پگوڈا میں نہ مسیحوں کے کلیسا میں حالانکہ اس کی بستی میں اور اس کی برادری میں مسیحی عقائد کے لوگوں کی ریل پیل ہے۔ خود میری باورچن مسیحی ہے اور رہا تنے بے بات سینے پہ کراس بنایا کرتی ہے یسوع مسیح کی قسمیں کھاتی ہے بائبل کے حوالے دیتی ہے اتوار کو چرچ ضرور جاتی ہے گرجا میں کوئی اسپیشل سروس ہو تو حتیٰ الامکان ضرور پہنچتی ہے مگر ملاں کو مطلقاً کسی بات کا احساس بھی نہیں ہوتا نہ احساس زیاں نہ خیال سود، بس وہ جس رو میں بہہ رہا ہے۔ . . . نے غم دزد نے غم کالا۔

کہتے ہیں ایک بار جوانی میں کوئی پادری ملاں کو ولایت لے گیا تھا مگر وہاں بھی اللہ کے اس بندے کے شب و روز میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی اور نہ حالت زار میں موصوف نے ترمیم قبول فرمائی: جیسے گئے تھے ویسے ہی (لوٹ) آگئے جیسے سوکھے ساون ویسے ہرے بھادوں خر عیسیٰ دیا گر بمکہ رود، چو باید ہنوز خر باشد کی ضرب المثل غالباً موصوف کے لئے وضع ہوئی ہے وضعداری میں مطلقاً فرق نہ آیا پہ نہ آیا لوگوں نے ایک صبح اچانک

یہ دریافت کیا کہ موصوف اپنی بستی میں مزے سے ٹہل رہے ہیں بہتیرا پوچھا کب آئے کیسے آئے کوئی جواب نہیں، غالباً ملاں جب گیا تھا تب بھی وہ گیا تھا کوئی اس کا جسم لے گیا تھا سو وہ جسم بھی روح سمیت واپس آ گیا جیسے بچھڑا ہوا بچہ ماں کی آغوش میں پہنچ کر چین محسوس کرتا ہے۔ اسی طرح بستی میں واپس پہنچ کر یہی احساس اسے بھی ہوا تھا موصوف پادری کے ساتھ جو نکہ رہے تھے۔ لہذا کچھ ناقص فقرے انگریزی کے چن لائے تھے وہی وقتاً فوقتاً استعمال کر لیا کرتے تھے جتنی ضرورت کفایت کرتی تھی اتنے ہی گنتی کے لفظ بولتے تھے پادری غریب کو جانے ان حضرات کے بارے میں کیا مغالطہ ہوا تھا اور کس لمحے یہ کشف ہوا تھا کہ آپ بھی کچھ صاحب کرامات ہیں کیونکہ سوچ کا استغراق دنیا سے بے نیازی اور دنیا والوں کی طرف سے کم التفاتی ہر کس و ناکس میں کہاں پائی جاتی ہے مگر جب موصوف کے شب و روز کا اس نے قریب سے مطالعہ کیا ہو گا تو پتہ چلا کہ یہ بے حسی ہے جو موصوف کا فطری جوہر ہے اسی بے حسی نے اسے ان دیہاڑوں پہنچایا تھا۔

میں ملاں کو جب کبھی روپے ڈیڑھ روپے کی ریزگاری پکڑا دیتا اور ایک آدھ سگریٹ دے دیتا تو بس اس کی عید ہو جاتی آس پاس کہیں میرے قدموں میں بیٹھ کر پاؤں دابنے اور حقہ گوئی کے طرارے بھرنے لگتا اس کے ہاتھوں میں وہ قوت آ جاتی کہ ناقابل بیان تھی، بلکہ یوں سمجھیے کہ ان ہاتھوں کے لمس کی زبان اس کے دلی انبساط و نشاط کی کیفیات مجھ پہ آشکار کر دیتی مجھے یقین ہے کہ ایسے کسی لمحے کے حصول کے لئے اگر میں ملاں کو ہزاروں اور لاکھوں روپیہ بھی دے دوں تو وہ کوڑے کا ڈھیر سمجھ کر لات مار دے گا کیونکہ ہزار اور لاکھ کی متاع اس کے لئے بے معنی ہے فی زمانہ یقین نہیں آتا کہ ایسے لوگ بھی پیدا ہو سکتے ہیں کہ جو ایسے بے نیاز ہیں، مگر اس بے نیازی میں عدم واقفیت کا عنصر بھی شامل ہے، بے نفسی کا بھی اور قناعت کا بھی۔

ایک روز باتوں باتوں میں میں نے ملاں سے پوچھا، "تو نے کبھی محبت بھی کی ہے؟"
ملاں بہت شرمایا، مگر آنکھوں میں چمک ایک لمحے کو آ کر غائب ہو گئی اور اس نے اقرار میں گردن ہلا دی۔ جب میں نے محبت کی داستان سننے کا شوق ظاہر کیا تو اس کی آنکھوں میں ٹمیالے اور کیچڑ زدہ آنسو آ کر ٹھہر گئے اور پھر کچھ کہے سنے بغیر وہ چلا گیا اور جین نے بہتیرا پکارا، رات کے سالن اور ناشتے کے ٹوسٹ اور مکھن کا مژدہ بھی سنایا گیا۔
مگر ملاں نے پلٹ کر رسید بھی نہ دی باورچن کو بہت حیرت ہوئی میرے پاس آ کر بولی
کیا بات ہے سر؟ کیا آپ نے ملاں کو نوکری سے جواب دے دیا؟
"نہیں تو" میں نے اس کی حیرت میں اور بھی اضافہ کر دیا، تو باورچن خود کلامی کے انداز میں بولی۔
"پھر کیا بات ہے، ایسا تو کبھی نہیں ہوا کہ ملاں ٹوسٹ اور مکھن کو یوں چھوڑ کر چلا گیا ہو؟"
" باورچن کے اس طرح سپر انداختہ ہونے سے محظوظ ہو کر میں نے خوشی دل سے ایک سوال داغا۔
" تم نے کبھی محبت کی ہے؟"
"میں نے سر؟" ادھیڑ عمر کی باورچن یکدم گھبرا گئی۔ جلدی سے سینے پہ کراس بنا کر کنفیشن کے انداز میں بولی "کی ہے سر!"
میں نے کہا "یہ سوال میں نے ملاں سے کیا تھا جس کے جواب میں وہ رو دیا اور روتا ہوا چلا گیا"
"ہائے" وہ تلملا کر بولی۔ "چوٹ کھایا ہوا ہے۔ شاید سر۔ بیچارہ چچ چچ چچ"
اس واقعے کے بعد پھر کبھی میں نے تو ملاں سے اس موضوع پہ بات کی اور نہ اسے زچ کیا۔ کچھ دنوں سے ملاں کچھ کھویا کھویا سا رہتا تھا، ایک غیر ملکی خاندان کا ذکر خیر

بڑے جوش وخروش سے کیا کرتا تھا۔ اچانک ملاں کے چہرے پہ فکر وتردد کے جو نشانات پیدا ہوئے تھے غائب ہو گئے اور ان کی جگہ ایک فرحناک طمانیت اور آسودگی نے لے لی یہ کوئی معمولی بات نہ تھی ملاں کی زندگی کا غیر معمولی حادثہ تھا جس کی بجا طور پر مجھے کھوج ہوئی۔ مگر میں اس بات میں کمال احتیاط سے کام لے رہا تھا کہ مبادا کوئی بات ملاں کے مزاج کے خلاف نہ گزرے اس کے ساتھ ہی ساتھ ایک تغیر اور بھی ہوا کہ میری یادرہی یوں تو جب کبھی توسٹ مکھن دیتی ملاں بھوکوں کی طرح ٹوٹ پڑتا مگر اب ٹوسٹ اور مکھن لے کر فوراً باہر چلا جاتا، یہ دونوں باتیں کوئی معمولی نوعیت کی باتیں نہ تھیں ایک روز میں یا تپ میں

آرام کرسی پہ نیم دراز ہوکر ~~مزے سے~~ تمباکو .

بھر رہا تھا اور آرام کرسی پہ نیم دراز ہوکر مزے سے تمباکو نوشی کا لطف اٹھا نا چاہتا تھا کہ میں نے ٹوسٹ اور مکھن لئے ہوئے ملاں کو باہر لپکتے ہوئے دیکھا، پھر - مین گیٹ سے کھٹ سے وہ باہر ہو گیا میں بھی دبے پاؤں گیا اور گیٹ کے پاس کھڑا ہو گیا باہر دیکھا تو ایک رشین پپی مزے سے مکھن اور ٹوسٹ اڑا رہا تھا اور دم ہلا رہا تھا اور ملاں مزے سے اسے یوں تک رہا تھا، جیسے ماں دن بھر کے تھکے ماندے بچے کو کھانا کھلا کر پنکھا جھل کر آسودگی محسوس کرتی ہے، میں دبے پاؤں چلا آیا اور ملاں کو خبر نہ ہونے دی.

کچھ روز کے بعد میں نے ملاں سے کہا، مجھے ایک خوبصورت رشین پپی کی ضرورت ہے۔ ملاں نے ہاں یانہ میں کوئی جواب نہ دیا چپکا اٹھا اور باہر نکل گیا میں دبے پاؤں باہر گیا دیکھا تو ملاں رشین پپی کو دبوچ کر اور بھینچ بھینچ کر پیار کر رہا ہے اور اسی طرح دبوچے دبوچے اسے لے جانے لگا جیسے یہی اس کی واحد متاع ہو، اور جیسے اس پہ میں ڈاکہ ڈالنے چلا ہوں مگر اس کی نگاہ مجھ پہ پڑی تو وہ سہم گیا ،، نہیں نہیں، صاحب جی، یہ پپی میں آپ کو نہیں دے سکتا،، اور پھر وہ جس قدر تیزی

سے دوڑ لگا سکتا تھا اس نے لگا دی اور رفو چکر ہو گیا۔

مگر دوسرے دن، میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب برآمدے میں پپی مزے سے دم ہلا رہا تھا اور پسندیدگی کا اظہار کر رہا تھا البتہ ملاں کا کہیں دور دور تک پتہ نہ تھا میں نے باورچن کے ذریعہ اِدھر اُدھر معلوم کرایا مگر بے سود، معاً میری نگاہ بینڑی کے پچھواڑے نے پڑی ملاں بیٹھا رو رہا تھا، مجھے دیکھ کر اور بھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور میرے قدموں میں ڈھیر ہو کر سسکیاں بھرنے لگا۔

مجھے معاف کر دیں، صاحب جی مجھے معاف کر دیں، میں نے پپی کو دینے سے انکار کیا تھا آپ تو میرے مائی باپ ہیں۔ آپ کے گھر تو یہ پپی زیادہ خوش رہ سکتا ہے ٹوسٹ مکھن دہی دودھ پنیر گوشت سب کچھ کھا سکتا ہے میرے پاس کیا ہے، میں خود آپ کے در کا کتا ہوں اپنا پیٹ کاٹ کاٹ کر کب تک کھلاؤں گا"

میں نے اسے اپنے قدموں سے اٹھایا تو وہ بلک بلک اور تڑپ تڑپ کر رو رہا تھا اس کی ہچکیاں بندھی ہوئی تھیں میں نے کہا۔

"ملاں تم بھی میرے رہو گے اور پپی تمہارے پاس رہے گا"۔

وہ بولا "صاحب جی، آپ کو پتہ نہیں، پپی کو میں نے بچایا ہے۔ اسے گولی ماری گئی تھی میں اسے چرا لایا، وہ پپی کے قریب ہی بیٹھ گیا اور اپنے کالے کلوٹے موٹے موٹے بھدے ہاتھ کی انگلیوں کو اس کے نرم نرم سپید سپید برف جیسے روئی کے ریشم میں ڈبو دیا۔ ننھے منے کتے کے سُرخ سُرخ منہ سے زبان باہر نکلی اور اس ہاتھ کو محبت سے چاٹنے لگی جس میں زندگی کا پیغام موجود تھا کتے کے اس اظہار تشکر کو سمجھ کر دوسرے ہاتھ سے اس کے منہ کو اوپر اٹھا کر ملاں بولا۔ اس کی آنکھوں کو دیکھیں صاحب جی، اس کے مالک مالکن ولایت واپس جا رہے ہیں، صاحب میم صاحب سے بولا کل پپی کو گولی مارنا ہے یہ کالے لوگوں کے پاس کیسے رہے گا، بس جی،

میں نے اسے رات چرا لیا"

"تم نے اچھا کیا ملاں، ایک قیمتی جان بچالی"

"کیسے ہوتے ہیں یہ لوگ صاحب جی۔ جب تک جی چاہا پیار کیا، جی بھر گیا تو گولی ماردی"

"خود غرض، مطلبی اور بے مروت" میں نے کہا اور باورچن کو بلا کر دودھ منگا کر اپنے ہاتھ سے بچی کو پلایا۔ جاتے وقت ملاں کے ساتھ بچی کو روانہ کر دیا دوسرے روز ملاں اور بچی دونوں میرے گھر ساتھ ساتھ آنے لگے اور میرے پس خوردہ راشن پر گزر بسر کرنے لگے اور مگن رہنے لگے مگر یہ چرخ کج رفتار غریب ملاں کی اتنی سی خوشی بھی دیکھ نہ سکا ایک رات جب ملاں اپنے گھر میں سویا ہوا تھا اس ننھی منی خوب صورت سی جان کو کوئی چرا کر لے گیا بہت دنوں تک ملاں دیوانوں کی طرح بچی کو تلاش کرتا شہر کے کوچے کوچے کو چھان ڈالا بستی بستی کو کھنگال ڈالا مگر گم ہونے والی چیزیں کہاں ملا کرتی ہیں۔ بیچارہ صبر شکر کر کے بیٹھ رہا اور سابقہ معمول کے مطابق زندگی گزارنے لگا البتہ کبھی کبھار بچی کو خواب میں دیکھتا تو اس کا ذکر مجھ سے یا میری باورچن سے ضرور کرتا اور غالباً ہماری تواضع کا تقاضہ یہی تھا کہ ان خوابوں کو سکون اور دلجمعی سے سن کر یا تو خاموش ہو جائیں اور یا ایک آدھ کلمہ خیر کہہ دیں کہ زخم پر مرہم کا کام کرے۔

کہتے ہیں کہ وقت بڑے سے بڑے اور گہرے سے گہرے زخم کو بھی مندمل کر دیتا ہے بچی کی جدائی کا زخم بھی بھرنے لگا یا یوں سمجھئے کہ زندگی کی نت نئی مصروفیتیں اور دلچسپیاں کچھ اس طرح پے در پے پیدا ہونے لگیں کہ بچی کا تصور ماند پڑنے لگا یوں بھی ملاں کچھ ایسا نرم دل اور رقیق القلب واقع ہوا تھا کہ کوئی نہ کوئی الجھن کوئی نہ کوئی واقعہ اسے اپنی طرف کھینچ لاتا چنانچہ میرے پڑوس میں ایک ملک سے ہجرت کر کے آنے والا خاندان ملاں کی دلچسپی کا مرکز بن گیا جس ملک سے اس کنبے نے ہجرت کی تھی وہاں ایک غیر ملکی طاقت کے اشارے پہ خونیں ڈراما کھیلا گیا ہزارہا افراد مارے گئے سینکڑوں گھر بل

کر خاکستر ہو گئے۔ بستیاں بمباری سے مسمار ہو گئیں کتنی مائیں بچوں سے محروم ہو گئیں۔ کتنے
بچے ماں باپ کے پیار سے محروم ہو گئے کتنی سہاگنیں اپنے شوہروں سے سدا کے لیے
جدا کر دی گئیں۔ ملاں ان غمزدہ لوگوں کی زبان نہیں سمجھتا تھا ہر ایک کا منہ تکا کرتا تھا
مگر بہتے ہوئے آنسوؤں اور رستے ہوئے زخموں کی صرف ایک ہی زبان ہوتی ہے
جسے دکھے ہوئے دل خوب سمجھتے ہیں ان بلاکشوں کا صرف اتنا قصور تھا کہ انہیں اپنی
کی آبائی بستیوں سے بے دخل کیا گیا تھا انہیں امن پسندوں کے درمیان رخنہ قرار
دیا گیا تھا۔ ملاں فوراً ان کا ہمدرد بن گیا اور تن من دھن سے ان کی خدمت بجا
لانے لگا اس تندہی سے کام کرنے کے سبب میرے کاموں سے غفلت اور کوتاہی
بھی برتنے لگا جس پہ مجھے دکھ تو ہوا مگر اس کی افتادِ طبع کو سمجھ کر صبر کرنا پڑا خیال تھا کہ
جلد یا بدیر ملاں کے سر سے اس کنبے کا بھوت بھی اتر جائے گا اور پھر اپنے معمول کے
مطابق وہ اپنے سارے کام انجام دینے لگے گا مگر ایک صبح میری باورچن نے اچانک
یہ دریافت کیا کہ ملاں بنگلے کے گیٹ پہ اونگھنے کے بجائے لفٹ رائٹ کر رہا ہے اور
فوجی انداز سے پریڈ کے قواعد بجا لا رہا ہے بے چاری سمجھی کہ پاگل ہو گیا ہے دوڑی دوڑی
میرے پاس آئی اور بولی۔ "سر ملاں تو پاگل ہو گیا، وہ تو پریڈ کر رہا ہے۔ میں نے جا کر
دیکھا تو وہ سچ مچ اس بڈھیوں کے ڈھانچے میں جو نیا جوش و خروش اور نیا ولولہ دوڑ رہا تھا
کہ اور خود وہ نئے پناہ گزین پڑوسی اس کے حرکات و سکنات دیکھ دیکھ کر محظوظ ہو رہے تھے
پناہ گزین کنبے میں ایک قدرے ادھیڑ عمر ماں تھی جو دن بھر کام کاج میں جتی رہتی تھی دو نوجوان
لڑکے تھے زید اور خالد ایک نوجوان لڑکی لبنیٰ اپنے خالی اوقات میں تینوں کے
تینوں فوجی مشقوں کی تربیت حاصل کرتے تھے۔ اور جن جن داؤ پیچ کی مجاہدوں کو ضرورت
ہوتی وہ سب داؤں ایک دوسرے کو سکھاتے تھے انہیں کو دیکھ دیکھ کر ملاں پر یہ
رنگ چڑھا تھا چنانچہ اپنے ہی گھر ملاں کو کرتے دیکھ کر وہ اسے مسخرہ سمجھ کر ہنس رہے تھے

جب ذرا جوش ٹھنڈا ہوا اور باورچن کے پاس انگریس خوردہ گیا تو وہ ہنس کر بولی "کیا لام پر جنگ کرنے جا رہا ہے"

ملاں بولا "ہاں جا رہا ہوں"

ایک روز مجھے مطالعے میں مستغرق پا کر دبے پاؤں میرے پاس آیا اور سرگوشی کے انداز میں بولا

"صاحب جی، یہ فلسطین کہاں ہے"

ملاں نے فلسطین کے بارے میں شاید زندگی بھر کچھ نہ سنا تھا نہ اس کے جغرافیہ کی خبر تھی اور نہ اس کی تاریخ سے واقف تھا جب میں نے مختصراً سمجھایا تو اس پناہ گزین کنبے کے بارے میں سارے واقعات اور معاملات اس کے ذہن میں آئینہ ہو گئے اور اس کے ساتھ ساتھ محاذ جنگ پہ جانا چاہتا تھا اس بات کا اظہار اس نے اشاروں اشاروں سے کیا بھی، بار بار کیا مگر ہر بار وہ تینوں کے تینوں اس کے حرکات و سکنات مسخرے پن کے سوا اور کچھ نہ سمجھ سکے۔ ایک رات اچانک وہ تینوں غائب ہو گئے اور اپنے مشن پر خفیہ طور پر روانہ ہو گئے۔ جس کا بہر حال اندازہ کیا جا سکتا تھا مگر ملاں کو جب ان کے چلے جانے کا علم ہوا تو روتا پیٹتا کنبے کی بزرگ خاتون کے قدموں میں جا کر ڈھیر ہو گیا۔ میری باورچن کا بیان ہے کہ جب اسے قدموں سے اٹھایا گیا تو اس کی روح اپنے قفس عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔

اپنا آدمی

کوئی گیارہ بجے رات کے اندھیرے میں بیگم اکرام نے جوڈرائینگ روم میں پہنچ کر بتی جلائی تو ایک شخص کو نہایت فراغت اور دل جمعی سے صوفے پہ براجمان پایا، دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر اُچھل پڑے، بیگم صاحبہ نے خوف زدہ سی گھگھی بندھی ہوئی آواز میں کہا: "تم کون ہو، اندھیرے میں کیوں بیٹھے تھے"؛

چور نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا "میں ملاقاتی ہوں، صاحب کے پاس ملاقات کے لیئے آیا تھا"

بیگم صاحبہ نے پاؤں سے جوتی اتار کر ماری تو چور نے نہایت اطمینان سے اُسے کرکٹ کے بال کی طرح کیچ کر کے آہستہ سے زمین کے فرش پہ ٹکا دیا۔ بیگم صاحبہ نے کھسیا کر دوسری جوتی بھی اسے کھینچ ماری اسے بھی کیچ کر کے اس ظریف الطبع چور نے کہا "بہت خوب صورت اور قیمتی جوتیاں ہیں انہیں سنبھال کر رکھیئے"۔۔۔۔ ابھی شائد وہ کچھ اور بھی خوب صورت جملے استعمال کرتا کہ بیگم صاحبہ نے اچانک شور مچا دیا۔۔۔

چور، چور، چور۔"

اسی وقت تمام کوٹھی کے ملازمین دوڑ کر جائے واردات پہ پہنچ گئے اور نہایت بے دردی سے اس غریب کو مارنا شروع کر دیا آس پاس اور اڑدس پڑوس کے لوگ بھی جمع ہو گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے سارا محلہ اکٹھا ہو گیا کسی نے پولیس کو فون کر دیا اور کچھ ہی دیر میں پولیس والے بھی پہنچ گئے اور چور صاحب نہایت اہتمام سے پولیس

کی معیت میں پولیس چوکی بھجوا دیئے گئے۔ اب اکرام صاحب کے دوستوں اور عزیزوں کے فون پر فون آنا شروع ہو گئے۔ صاحب موصوف کلب سے کوئی ایک بجے رات میں تشریف لائے تو اس تمام واردات کا علم ہوا، کسی نے کہا:

"صاحب بڑا خراب زمانہ آگیا ہے کیسے دیدہ دلیر چور ہیں، کس مزے سے ڈرائنگ روم میں آکر فروکش ہو گئے۔"

کسی نے کہا: "بے کاری اور بیروزگاری بڑھتی جارہی ہے یہ سارا دہی چکر ہے۔"

ایک شوخ سی خاتون نے اکرام صاحب کی طرف اشارہ کر کے کہا: "اگر مرد کی جگہ کوئی عورت اس طرح آئی ہوتی اور بیگم صاحبہ کی جگہ خود اکرام صاحب ہوتے تو کیا کسی واردات کا کسی کو پتہ چلتا ـ؟"

اکرام صاحب نے جھینپتی ہوئی نظروں سے مسکراتے ہوئے خاتون کو دیکھا اور منہ میں فوراً سگریٹ دبالی کہ اغیار پہ غمزۂ غماز کا راز نہ کھل جائے۔ ایک اور مقطع سے بزرگ نے فرمایا: "جب تک کہ سرِ عام ایسے چوروں کو دست بریدہ نہ کیا جائے گا یہ مردود مان نہیں سکتے۔" اسی قسم کے ایک اور صاحب گویا ہوئے کہ: "ایسے چوروں کو تو زمین میں آدھا گاڑ کر سنگ زنی کیجئے۔ کتے چھوڑ دیئے اور کھال کھنچوا کر بھوسہ بھروا دیکھئے؟"

ایک ظریف الطبع بزرگ بولے: "کتنے من بھوسے کی ضرورت ہو گی!"

اسی شوخ سی خاتون نے کہا: "چہ چہ چہ، ایسی کڑی سزا دی جائے گی بیچارے کو۔ اور جو اس کی لیلیٰ نے فریاد کی کہ کوئی پتھر سے نہ مارے میرے دیوانے کو، تو۔"

دوسری بیگم صاحبہ چہک کر بولیں: "لیجئے سنبھالئے اس مجنوں کی لیلیٰ ابھی سے فریاد کر رہی ہے۔"

تیسری نے کہا: "ہاں ہاں اسے تو پھولوں میں تولنا چاہیئے، جو نرن بھونرن میں رکھنا چاہیئے، آخر اس نے کام ہی ایسا کیا ہے۔"

ایک صاحب کو کچھ کچھ فارسی کی شدھ بدھ تھی، غالباً فارسی کے کچھ فقرے ذہن مبارک سے کھڑکھڑاتے رہتے تھے لہذا فوراً بولے

"چہ دلا ورست دزدے کہ بکف چراغ دارد"

دوسرے نے کہا: "نہیں جناب وہ تو اندھیرے میں آرام سے بیٹھا ہوا اکرام صاحب سے ملاقات کا منتظر تھا چراغ تو بیگم اکرام نے جلا کر بھانڈا پھوڑ دیا۔ کس مزے اور معصومی سے بیچارے نے ملاقات کی آرزو کا اظہار کیا تھا"

بیگم اکرام کی نند نے چھیڑتے ہوئے کہا "کیا پتہ ہماری بھابی کا کوئی پرانا ملاقاتی ہو"

بیگم اکرام نے اپنی نند کو ایک نہایتی گچکا رسید کرتے ہوئے پرے دھکیل دیا "نگوڑی بے شرم، مذاق بھی کرے تو چھچھورا، اور وہ بھی بیچ بازار"

عورتیں قہقہے لگاتی ہوئی ایک طرف کو چلی گئیں، اور اب مردوں کی مجرد محفل میں اس واقعہ پر طرح طرح سے طبع آزمائی شروع ہوئی۔

دوسرے روز بھی تمام دن لوگوں کا تانتا بندھا رہا، فون آتے رہے اور اس موضوع کا چرچہ سارے شہر میں رہا۔ کسی من چلے نے اخبار میں بھی یہ شوشہ چھوڑ دیا تھا۔ اکرام صاحب بھی اپنی مقبولیت پر خوش تھے اور پولیس بھی اپنی کارکردگی پر مطمئن تھی صاحب موصوف چونکہ شہر کے سربرآوردہ رئیس تھے اور نہایت معزز آدمی شمار ہوتے تھے لہذا دو دن تک کبھی اکرام صاحب اور کبھی بیگم اکرام کو آنے والوں فون کرنے والوں کو بار بار ایک ہی کہانی سنانی پڑتی تھی دونوں کے دونوں بظاہر تھک کر اپنی مصیبت کا ایک دوسرے سے رونا روتے کہ ہر ایک سے ایک ہی بات بتا بتا کر وہ کس قدر تھک چکے ہیں تب بھی ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھ دیکھ خوش ہوتے کہ دیکھو ہم کتنے سوشل ہیں اور لوگوں میں کس قدر مقبول ہیں کیونکہ سوسائٹی

میں آخر یہی تو مواقع ہوتے ہیں کہ آدمی کو پتہ چل سکے کہ آخر وہ کتنے پانی میں ہے، لوگوں پر اس کی ہیبت اور دبدبہ کتنا ہے وغیرہ وغیرہ۔

یہ سلسلہ جاری تھا اور لوگ برابر تعزیت کرنے کے لئے آجا رہے تھے کہ ایک دن اس تمام انبوہ میں ایک شخص چپ چاپ بیٹھا یہ سارا تماشہ دیکھ رہا تھا جو نہ منہ سے بولتا تھا، اور نہ سر سے کھیلتا تھا، ٹک ٹک ایک ایک کو دیکھتا تھا جب ایک ایک کرکے سارے لوگ رخصت ہو گئے تو وہ شخص اٹھا اور اکرام صاحب کے کان میں چپکے سے کچھ کہا، جسے سُن کر وہ سناٹے میں آگئے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ بیگم اکرام نے کہا:

"خیر تو ہے!"

بولے: "بڑی غلطی ہو گئی!"

بولیں: "کیا؟"

کہنے لگے: "اب اس کی ضمانت کیسے ہو؟"

"کیا مطلب، کس کی ضمانت"؟

"اُسی کی"

"یعنی چور کی ۔۔؟"

اکرام صاحب نے کمزور سی آواز میں "ہوں" کہی اور چپکے سے بولے:

"وہ تو اپنا ہی آدمی ہے!"

کہوں تو مکھ جر جائے

یہ میرا روزانہ کا معمول تھا کہ رات کی ڈیوٹی شروع ہونے سے قبل کنٹین میں بیٹھ کر ایک کپ گرم گرم چائے پیتا، دو تین سگریٹیں پے بہ پے پی لینے کے بعد ساری رات کام کرنے کے لیے تازہ دم ہو جاتا ٹیلی پرنٹر پر خبریں آتی رہتیں، نیچے پریس میں اخبار چھپتا رہتا لیکن مجھے اپنے کام سے کام رہتا۔ قلم ہوتا اور کاغذ اور میں بے تکان لکھتا چلا جاتا، جب لکھ کر سر اٹھاتا ایش ٹرے سگریٹ کے ٹکڑوں سے اٹا پڑا ہوتا۔ گھڑی رات کے دو یا ڈھائی بجا رہی ہوتی اور میرا کالم بالکل تیار ہوتا جھٹ پٹ کمپوزیٹر کالم لے کر بھاگتا اور ایک گھنٹے میں پروف پڑھ کر جب میں کرسی سے سر اٹھاتا تو تازہ اخبار میں تازہ ترین خبروں پر میرا کالم موجود ہوتا۔

ان باتوں سے کہیں آپ یہ نہ سمجھ لیں کہ میں اخبار کی کوئی کہانی سناؤں گا، یا اپنی بپتا لیکر بیٹھ جاؤں گا ہرگز نہیں بلکہ مجھے یہ بتانا ہے کہ رات کی ڈیوٹی سے عموماً مستورات کو مستثنیٰ رکھا جاتا ہے مگر میری رفیق کار بالعموم رات کی ڈیوٹی لگواتی ہے اور نہایت متعدی سے کام کرتی ہے میری میز کے بالمقابل اس کی میز ہے کاغذات کے پلندوں، فائلوں اور کتابوں کے انبار میں ایک دبی دبائی ایک گھٹی سی دبلی نیلی سانولی سی لڑکی جو بمشکل بچیس چھبیس سال کی ہو گی بیٹھی بیٹھی کالم گھسیٹتی رہتی ہے اس کے چہرے میں نہ تو کوئی کشش ہے اور نہ خط و خال میں وہ جاذبیت، جو جوان عورتوں کا طرۂ امتیاز سمجھی جاتی ہے ؛ بلکہ زندگی کی چمک اس کے چہرے سے سرے سے غائب ہے شوخی اور دلربائی

تو رہی ایک طرف، بانو تو مسکراتی تک نہیں جیسے اس کے وجود کے بہت اندر سے کھرچ کھرچ کر ساری خوشیاں نکال کر پھینک دی گئی ہوں، جیسے بہت گہرائی کے اندر سے اسے خوب نچوڑ ڈالا گیا ہو۔ حزن و ملال تو اس کے ایک ایک مسام سے ابلتے ہوئے محسوس ہوتے۔۔ آنکھوں کی طرف دیکھو تو لگتا کہ جیسے کسی ریگستان سے بگولے اٹھ رہے ہوں نگاہیں جما کر چند لمحے بانو کو دیکھ لو تو لگتا ہے کہ اس کے وجود کا سناٹا دھیرے دھیرے تمہاری روح میں حلول کر گیا ہے اور تمہاری روح کا پرندہ ایک ویرانے میں بنے ہوئے تن تنہا مقبرے کے گنبد میں پھڑپھڑا رہا ہے میں یقین دلاتا ہوں کہ آج تک گنتی کے لمحوں سے زیادہ میں نے بانو کی طرف کبھی نہیں دیکھا، دیکھتا کیا خاک، دیکھنے کی ہمت ہی نہیں ہوتی۔ اگر بانو پر اتفاقیہ نگاہیں ٹھہر بھی جاتیں، تو لگتا کہ میں کسی بوسیدہ سی ممی کو دیکھ رہا ہوں جو وقت کے شکنجے میں جکڑ کر رکھ دی گئی ہے۔

بانو بڑی خاموشی سے دفتر میں داخل ہوتی اور اپنے تو بڑے سے سگریٹ کی لاتعداد ڈبیاں نکال کر میز پہ اپنے سامنے ڈھیر لگا دیتی اور پھر لگاتار صبح تک دھواں اگلتی رہتی کبھی کبھی تو مجھے یوں لگتا کہ جیسے ہم دونوں چمنیاں ہوں جو صرف دھواں اگلتی رہتی ہیں ایسا نہیں ہے کہ ہمیں سگریٹ کے مہلک اثرات کا علم نہ ہو، ہم تو خود اپنے قلم سے اس کے بیشتر نقصانات گنواتے تھے مگر ہم خود سب سے زیادہ سگریٹ پیتے تھے بلکہ کثرت سگریٹ نوشی میں بانو سے میرا کوئی مقابلہ نہ تھا۔ ایک بات اور بھی ہے کہ بانو بعض اوقات سخت بدبودار سگریٹ پیتی تھی اور گاڑھے گاڑھے دھوئیں کی چادریں کی چادریں اس کے منہ سے نکلتیں اور اس کے سارے وجود کو چھپا لیتیں اور اس لیے مجھے بانو سے سخت گھن آتی میرے حلق میں پھندا سا پڑ جاتا اور میں بالعموم کمرے سے باہر نکل جاتا۔ یہی نہیں بلکہ بانو اپنے تو بڑے سے کئی شیشیاں نکالتی اور ان گنت ٹکیاں، گولیاں اور کیپسول حلق میں اتار کر چائے کا گھونٹ پیتی اور بدبودار سگریٹ کا کش لگاتی ہوئی آرام کرسی پہ ڈھیر ہو جاتی

صبح تک وہ اسی کرسی پہ کسی مردے کی طرح پڑی رہتی جب ہوش آتا تو دن کی شفٹ
شروع ہو چکی ہوتی اور وہ اپنا تو بڑا اٹھا کر خاموشی سے باہر نکل جاتی اور بے پناہ خلقت کے
ہجوم میں گم ہو جاتی۔

بانو اپنے فن میں چوکس اور کام میں ماہر تھی۔ اسے تخلیقی زبان پہ بے پناہ قدرت تھی
اور تمام دنیا کے حالات ہمہ وقت اسے مستحضر تھے دنیا کے تمام ملکوں کے کوائف اس کے
ناخنوں میں پڑے تھے ساری سیاسی شخصیتوں کے مزاج اور مذاق سے بھی وہ آگاہ تھی
اور ان شخصیتوں کی علمی استعداد پہ بھی اس کی گہری نظر تھی بانو کی رائے میں انتہائی
اصابت، بلوغت، پختگی اور سوجھ بوجھ ہوتی تھی۔ ملک کے باہر بھی اس کی تحریروں کو سراہنے
والا ایک قابلِ لحاظ طبقہ موجود تھا بانو کو اگر کسی نہ کسی وجہ سے اخبار سے علیحدہ بھی کر دیا
جاتا تو دنیا کے کسی بھی بڑے سے بڑے ملک کے بڑے اخبار میں وہ بآسانی اپنی جگہ بنا سکتی تھی۔
حقیقت یوں ہے کہ بانو کو اخبار کی نہیں اخبار کو بانو کی ضرورت تھی۔ مجھے یہ بھی اعتراف کرنے
دیجیے کہ مٹھی سی اس لڑکی کی باطنی وجاہت کے سامنے میرا تیس سالہ صحافتی تجربہ ہیچ تھا۔

اکثر میرا جی چاہتا کہ ہر لمحہ موت سے قریب اور قریب تر ہونے والی بانو کا ہاتھ پکڑ لوں
اور اسے دنیا کے تمام ملکوں کے بڑے بڑے صحت افزا مقامات کی سیر کراؤں۔ اسے
نشاط و انبساط کے گہرے ساگر میں اتاروں، خوشیوں اور مسرتوں کے پھولوں سے اس
کے دامن کو بھر دوں تاکہ وہ بھی زندگی کا مزہ چکھے اور اس لذت کام و دہن میں ایسی
ڈوبے کہ اسے مطلقاً کسی قسم کے دکھ اور غم کا احساس تک نہ ہو، مگر جی چاہتا تو رہا ایک طرف
بانو سے اس قسم کی بات کرنے کے تصور ہی سے یہ احساس ہوتا ہے کہ جیسے اس کی توہین ہو
رہی ہے اس کی باطنی وجاہت کو ٹھیس پہنچ رہی ہے اور اس کے وقار کو دھچکا لگ رہا
ہے اور ظاہر ہے کہ اس توہین پر میں کبھی آمادہ نہ ہو سکا۔

کینٹین میں ایک بار چائے پیتے ہوئے ہمارے ایک مولانا قسم کے دوست نے

جب بانو کو اس ہیئت کذائی میں دیکھا تو لگے لمبی لمبی لاحولیں پڑھنے اور الٹے سیدھے تبصرے کرنے مگر بانو نے مطلقاً اس شخص کی طرف دھیان نہ دیا وہ کبھی کسی شخص کی بات کی طرف دھیان نہ دیتی کہ کون کس طرح اس کی شخصیت کا نوٹس لے رہا ہے اس کی تحریر میں اس قدر گہرائی اور مغز ہوتا تھا کہ اس قسم کے فقرے اور پھبتیاں کسنے والے اس کی وجیہہ شخصیت کے مقابل بونے اور کوتاہ قد نظر آتے تھے وہ اس کائنات کو بے مقصد اور بے معنی قرار دیتی تھی ہمارے چند احباب نے اس کے نظریات کے اس چیلنج کو کئی بار قبول کر کے بزعم خویش بڑے پرمغز مقالات لکھے۔ لیکن بانو چند فقروں اور چند دلیلوں میں سارا معاملہ صاف کر کے انہیں زچ کر دیتی تھی ہمارے ایک دوست نے کائنات کو بامقصد ثابت کرنے کے لئے سائنس اور فلسفے کے سارے حربے آزما ڈالے مگر بانو کو اپنی جگہ سے نہ ہلا سکے اور اس بھاری پتھر کو چوم کر چھوڑ گئے خیر یہ تو عام سی بات تھی کہ بانو کو لامذہب اور کافر ہونے کے فتوے اکثر دیئے جاتے تھے مگر دانشوروں کا خیال تھا کہ جہاں استدلال میں قوت نہیں رہ جاتی اسی قسم کے ہتھیار آزمائے جاتے ہیں۔ جہاں تک میری رائے ہے میں قلب اور مومن دماغ کا فرق کا قائل تھا اور یہ سمجھ رہا تھا کہ فکر اور عقل کے جس راستے پہ بانو چل رہی ہے نہ کسی دن اسے گھنی چھاؤں والا چھتنار درخت مل جائے گا تو وہ کڑی دھوپ میں کڑے کوسوں کا پاپیادہ سفر ختم کر دے گی جس میں جگہ جگہ پہ وہ آبلہ پا نظر آتی تھی اور زخموں سے چور چور ہو گئی تھی۔

بانو پہ مجھے ترس ضرور آتا تھا لیکن میں اس کا اظہار نہیں کرتا تھا ایک بار بانو چرس کا سگریٹ پی رہی تھی اس کے حلق میں پھندا لگ گیا میں اٹھا اور لپک کر پانی کا گلاس بھر کر لے آیا اور بانو کو تھما دیا اور اس نے گلاس لے کر ایک طرف [رکھ دیا] اور ایک بوند بھی پانی نہ پیا۔ مجھے لگا جیسے وہ ایک ریگستان میں کھڑی ہو جہاں دور دور تک پانی نہ ہو اور وہ ریگستان سے چشمہ نکالنے کا عزم لے کر چلی ہو تو معاً کوئی شخص نمودار ہو کر اسے پانی کا مشکیزہ پیش

کر دے مگر اس ترحم کو وہ ہرگز برداشت نہیں کرے گی فوراً مشکیزے کا پانی ریت میں بہا دے گی اور جب تک اپنے قوت بازو سے خود چشمہ پیدا کر لے ایک بوند نہ پیئے گی۔
کیونکہ تھوڑی ہی دیر کے بعد بانو خود اٹھی. گلاس کا پانی پھینکا دوسرا پانی بھرا اور گھونٹ گھونٹ پینے گی بانو کے اس طرز عمل کو دیکھکر کوئی شخص بھی اپنی اس توہین پر تلملا سکتا ہے تلملاہٹ مجھے بھی ہوئی مگر سالہا سال سے جس طرح ہم ایک دوسرے کو دیکھتے چلے آرہے ہیں ایک دوسرے کو برتتے اور ایک دوسرے کو سمجھتے چلے آرہے ہیں اس کے پیش نظر مجھے چند لمحوں بعد ہی اپنی تلملاہٹ بالکل فضول اور بے معنی نظر آئی کیونکہ اگر لکھتے لکھتے بانو کے سگریٹ اچانک ختم ہو جائیں تو وہ بلا تکلف میرے سگریٹ کے پیکٹ اٹھا کر دھکا دھک سگریٹ پینا شروع کر دے گی یہ دوسری بات ہے کہ دوسرے روز ایک کی جگہ دو اور دو کی جگہ چار پیکٹ میز پہ لا کر رکھ دے گی۔

اس روئداد سے کہیں آپ یہ اندازہ نہ لگا لیں کہ ہم دونوں کے دونوں محض بت ہیں اور سوائے لکھتے رہنے یا سگریٹ پیتے رہنے کے اور کوئی حرکت ہم سے سرزد ہی نہیں ہوتی، نہیں ایسا نہیں ہے. ہم مسکراتے بھی ہیں، ابسورتے بھی ہیں، اور بھی کتنی ہی ایسی چھوٹی چھوٹی حرکتیں ہیں کہ جو دیکھی جا سکتی ہیں کہ ان کے ہم مرتکب ہوتے ہیں یعنی کھجلی ہو تو کھجاتے بھی ہیں ناخنوں کو رگڑتے ہیں، آنکھیں ملتے ہیں پلکیں جھپکاتے ہیں، کھانسی آجائے تو کھانستے بھی ہیں چھینکتے بھی ہیں مزہ یہ کہ نہ الحمد اللہ زبان سے نکلتا ہے نہ یرحمک اللہ اور نہ اک کیمونزمی یعنی ہم دونوں کا رشتہ قلم، دوات، میز، کرسی، دیوار، الماری کی طرح میکانکی بھی ہے اور اور نہیں بھی ہے اس لئے کہ ان چیزوں کا وجود ناگزیر سمجھتے ہوئے کہ قلم سے ہم لکھتے ہیں کرسی پہ بیٹھنے اور میز پہ قلم دوات رکھ کر لکھتے ہیں الماری میں ضروری اشیائ محفوظ کر لیتے ہیں، اگر قلم کی نب بیکار ہو جائے دوات میں روشنائی نہ رہے، کرسی کا پایہ ٹوٹ جائے، میز کا تختہ اکھڑ جائے، الماری کا کنڈا از کار رفتہ ہو جائے تو ہم پریشان ہوتے ہیں مگر

ہوتا ہے اثر دو ہوتا ہے اور ہماری عادتوں نے ان اشیاء سے ہمارا ایک میکانکی رشتہ باندھ رکھا ہے اور نہیں اس لئے کہ یہ ناگزیر ہوتے ہوئے بھی ہماری زندگی کا جزو لاینفک نہیں ہیں۔

ایک بار کوئی تین چار روز تک مسلسل بانو دفتر میں نہیں آئی۔ مجھے تنہا کام کی گاڑی کھینچنا پڑی اور وہ بات پیدا نہ ہو سکی جو اخبار کے لئے ضروری تھی اس تسلسل سے گھبرا کر میں اس کے گھر جا پہنچا۔ تنگ و تاریک گلیوں سے گزرتا ہوا میں ایک بہت ہی خستہ اور کہنہ عمارت میں پہنچا جہاں ادھیڑ عمر کی بجھی بجھی سی ایک عورت نے دروازے پہ استقبال کیا اور اندر ایک ٹوٹے پھوٹے حجرے نما کمرے میں لاکر بٹھا دیا۔ کچھ دیر کے بعد بھی بانو شال میں لپٹی ہوئی آئی اور آتے ہی بولی۔

"بیمار ہوں۔ کل سے دفتر آؤں گی۔ کبھی یہ ادھار چکا دوں گی۔"

ادھیڑ عمر کی عورت نے جو یقیناً اس کی ماں تھی، ایک پیالی چائے لاکر رکھ دی، جیسے زہر مار کرکے میں رخصت ہوا کہ اس سے زیادہ کی مجھ میں سکت نہ تھی اگر میں وہاں صدیوں تک بھی بیٹھا رہتا تو اس سے زیادہ مجھ سے بات نہ کرتی کچھ ہی عرصے کے بعد مجھے دو ہفتے کے لئے کسی دوسرے شہر جانا پڑا اور میری غیر حاضری میں بانو نے اخبار کا سارا بوجھ نہایت خوش اسلوبی سے سنبھال لیا۔ یعنی قرضہ مع سود ادا ہو گیا بانو کے چہرے پہ طمانیت آگئی اور بوجھ اتھ گیا۔

اتنی کھری اور اکل کھری لڑکی اندر سے کتنی گہری ہے یہ تجسس مجھے رہتا تھا، مگر وہ ایسی گانٹھ تھی کہ جس کا سب روشن کبھی نہ کھلا، وہ کیوں اسقدر دکھی مغموم اور دلگیر ہے کبھی پتہ نہ چلا لیکن میں دل ہی دل میں کہتا تھا کہ بی بانو جب تک اونٹ پہاڑ تلے نہیں آتا کسی سے نہیں دبتا، تم کتنی ہی بلند و قامت کیوں نہ بنو کبھی نہ کبھی اونٹ پہاڑ تلے ضرور آئے گا، تمہاری انا، خودداری اور ضبط کا یہ قد آور بت گرے گا اور بری طرح ٹوٹے گا اور جب ٹوٹے گا تو ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جاؤگی رہ پڑو گی، پھوٹ پھوٹ کر روؤگی مجھے

اس دن کا انتظار ہے جب تم بکھری پڑی ہو گی۔ یقیناً یہ سفاکی ہے اور میرے اندر ضرور کوئی نہ کوئی جلاد چھپا بیٹھا ہے جو اپنی انا کی تسکین کے لئے تم کو ٹوٹا پھوٹا دیکھنا چاہتا ہے مگر بہر حال مجھے اپنی تسکین اور طمانیت عزیز ہے خواہ تم اپنی شکست و ریخت سے برباد کیوں نہ ہو جاؤ، میری بلا سے، یہ میری محض خواہش تھی اور اپنی تسکین نخوت کے لئے میں اس طرح سوچتا تھا، میرا جذبۂ ترحم جذبۂ انتقام میں بدل چکا تھا اور یہ عمل اس قدر آہستہ روی سے ہوا تھا کہ مجھے مطلقاً اس کا پتہ نہ چل سکا۔

مجھے اچانک ایک روز فون پہ اطلاع ملی کہ بانو مر گئی۔

میں دوڑا اس کے گھر پہنچا، چند، محض چند لوگ جمع تھے، لاش رکھی تھی، ماں سوگوار بیٹھی تھی لیکن آنکھ سے نہ آنسو بہہ رہے تھے نہ ہونٹوں سے آہیں نکل رہی تھیں، بانو کی چند بہنیں بھی لاش کے گرد کرسیوں پہ بیٹھی گردن جھکائے ہوئے تھیں۔ کوئی بھی آہ و زاری نہیں کر رہا تھا، چند لوگوں نے لاش اٹھائی قبرستان میں لا کر دفنا دیا اور خاموشی سے لوٹ گئے۔

میں بھی بانو کے گھر سے چلا آیا اور یہ چاہتا تھا کہ لفافے میں کچھ رقم رکھ کر بانو کی ماں کو چپکے سے نذر کر دوں کہ بانو کی ماں نے مجھے دیکھتے ہی ایک پارسل لا کر دیدیا۔ میں نے گھر لا کر اسے کھولا تو اس میں چار پیکٹ سگریٹ تھے۔

شہر ناپرساں

اس نے لاپرواہی سے سگریٹ کا دھواں بکھیرتے ہوئے کہا، "نہیں گریز کر لو۔ جو لمحے لہریں بن کر تمہارے گرد منڈلا رہے ہیں مگر تم ایسا نہیں کر سکو گے، بلکہ لمحات کے اس گرداب میں خود پھنس کر کسی کمزور تنکے کی طرح بہہ جاؤ گے" خالد نے ریستوران میں کم ہوتے ہوئے گاہکوں اور بیشتر خالی میزوں اور کرسیوں پہ نگاہ ڈالی اور جواباً کہا، "اس معاشرے کے مسائل ایک چکنے گولے کی طرح ہیں جو تمہارے ہاتھ میں آتے آتے پھسل جاتا ہے لڑھک جاتا ہے اور لڑھکتا ہی چلا رہا ہے ہر شخص جھپٹ رہا ہے مگر۔۔۔ مگر"

انور نے ہاتھ اٹھا کر اسے روکا اور اس طرح آنکھیں بند کیے کیے جواب دیا جیسے وہ مہاتما گوتم بدھ ہو اور اپنے اندر کی روشنی کو پا گیا ہو اور اس روشنی کی لکیر کو باہر نے کر برآمد ہو رہا ہو، "ہم سب حرام خور، بدمعاش، کمینے اور ذلیل ہیں"۔

خالد نے کہا، "ہم بدنفس، خبیث اور انتہائی اچھے ہیں"

انور بولا "ہاں۔۔۔۔ اور جب میں یہ بات کہہ رہا ہوں تو یقین کرو میرا مطلب یہی ہے جو میں کہہ رہا ہوں، آئی ایم ٹیلنگ دہ وہائٹ آئی مین،، یعنی کہ میں انور ہوں، ایک کمینہ، بدمعاش چور اور خبیث النسان ہوں آئی مسٹ کنفس فرسٹ آل ٹو مائی سیلف۔ مجھے اپنی کمینگی دوسرے کے کندھے پر نہیں ڈالنا چاہیئے"۔

خالد نے کہا، "ایگزیکٹلی، ہیر لائیز دا پوائنٹ"۔

انور نے ؟ پھر کسی شانت مہاتما کے مانند کہا "اکسکیوزمی لٹ می فنش مائی پوائنٹ"

خالد بولا، یس یس پلیز کیری آن۔"

انور نے کہا کہ "ہماری کمینگی یہ ہے کہ ہم خواہ زندگی کے کسی شعبے سے تعلق رکھتے ہوں، اپنے فرائض اور اپنی ذمہ داریوں کو پورا نہیں کرتے۔ یقیناً اس کے اسباب ہیں، اسباب معاشرتی عمرانی تاریخی سبھی کچھ ہو سکتے ہیں۔"

خالد بولا، "صرف اقتصادی۔ اور صرف اقتصادی"

انور نے کہا۔ ہاں ہاں اقتصادی بھی مگر کیا ہم خود ایک سبب نہیں ہیں مثلاً میں ایک استاد ہوں، قوم مجھ سے سوال کرتی ہے کہ اس ملک کا ہر شہری ہر طالبعلم پہ تیس تیس روپیہ خرچ کر رہا ہے اس خرچ کے عوض قوم کو صفر کے برابر بھی فائدہ حاصل نہیں ہو رہا ہے۔ میں آسانی سے یہ کہہ دیتا ہوں کہ صاحب پہلے تو ہر جماعت میں بیس پچیس طالب علم ہوتے تھے۔ اب تو ایک سو دس ایک سو بیس ہوتے ہیں استاد اپنے شاگردوں کے چہرے بھی نہیں پہچانتا کہ طالب علم رخصت ہو جاتا ہے وہ جماعتوں کی بجائے کینٹینوں، ریستورانوں اور یونین کے دفتروں میں جو کچھ سیکھتا ہے وہی لے کر معاشرے میں گھس جاتا ہے اور دیمک کی طرح چاٹنا شروع کر دیتا ہے مگر میں یہ کیوں نہیں کہتا کہ میں خود جماعتوں میں نہیں جاتا دوستوں میں بیٹھ کر گپیں ہانکتا ہوں، سیاست بگھارتا ہوں، افسران بالا کی جوتیاں سیدھی کرتا ہوں ان کی ہاں میں ہاں ملاتا ہوں"

خالد نے کہا: یہی بنیادی بات ہے کہ ہم ایک غلط نظام میں جکڑے ہوئے ہیں ہمارا کوئی فعل ارادی اور اختیاری نہیں ہے ہم مصلحتوں کا شکار ہیں ہم ڈرتے ہیں، ہم سچی بات جانتے ہوئے بھی منافقت کرتے ہیں ریاکاری سے کام لیتے ہیں دراصل معاشرہ بہت سے تہہ در تہہ حلقوں میں بٹا ہوا ہے اور ہر ہر حلقے میں ہزار ہا مگرمچھ منہ کھولے بیٹھے ہیں اور مگرمچھ کے منہ سے بچ نکلنے کی فکر نے ہم کو ڈرپوک مصلحت بین اور منافق بنا دیا ہے ہم سچی بات جانتے پہچانتے ہوئے بھی کہہ نہیں سکتے کیونکہ ہم [illegible] سے ڈرتے

ہیں کہ افراد درندے ہیں اور انسان ترقی معکوس کے عمل میں مبتلا ہے تاریخ اپنی ابتدا کو دہرا رہی ہے کہ جب انسان انسان کی درندگی سے خائف تھا کیونکہ معاشرے میں جمہوری عمل نہیں تھا اب بھی معاشرے میں جمہوری عمل نہیں ہے ہم شخصیت پرست ہیں اور ہم شخصیتوں سے ڈرتے ہیں، ہم اصول پرست نہیں ہیں اور نہ اصولوں کا احترام کرتے ہیں اور — اور، خیر چھوڑو، شاید میں نے تقریر کر ڈالی، کیا خیال ہے؟"

" انور نے ہلکا سا قہقہہ لگایا، غالباً ہم دونوں تقریریں کرنے لگے ہیں، آؤ چائے کی طرف متوجہ ہوں"۔ ریستوران کی اس منزل میں سناٹا ہو گیا تھا صرف انور اور خالد موجود رہ گئے تھے مگر اس منزل کے نیچے سے موسیقی کی ہلکی ہلکی آوازیں آ رہی تھیں اور اِکا دُکا جوڑے اب بھی نچلی منزل میں اتر اتر کر چلے جا رہے تھے جہاں رقص و سرود کا بازار گرم ہو گا اوپر کی منزل کی طرف بھی اکا دکا لوگ چلے جا رہے تھے گو رات بھیگ چلی تھی مگر نہ جانے کہاں کہاں سے لوگ چلے ہی آ رہے تھے بیچ کی اس منزل میں بھی ویٹر نے صرف چند بتیاں جلتی چھوڑ دی تھیں بقیہ حصے میں اندھیرا کر دیا تھا۔ سڑک بھی اب نظر نہیں آ رہی تھی بڑی بڑی شیشے کی دیواروں پہ پردے کھینچ دیئے گئے تھے انور چائے بنانے میں اور خالد پاؤں کے پنجوں سے فرش پہ تھپکیاں دینے میں مصروف تھے معاً خالد نے کہا:

"یوں لگتا ہے کہ یہ فرش لکڑی کا نہیں ربڑ کا بنا ہوا ہے؟"

انور نے پوچھا وہ کیسے؟"

" کیونکہ ٹھک ٹھک کی آواز نہیں آتی، پنجے دھنس جاتے ہیں مخملیں قالین ہیں۔

ڈرو اس مقام سے کہ جہاں تمہارے پاؤں زمین پہ نہ ہوں انور نے راکھ دان میں سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے کہا معاً دونوں کی نظریں اٹھیں ایک دوسرے کی نگاہوں سے ٹکرائیں اور دونوں کے مابین جیسے کسی بے آواز بات کا تبادلہ ہوا۔ پھر دونوں خود بخود مسکرا دیئے۔ خالد نے کہا کہ، سچ پوچھو تو مجھے ڈر لگ رہا ہے!

"کس سے"؟ انور نے پوچھا۔

"اپنے آپ سے" اس نے چائے کے کپ کو ہونٹوں سے لگاتے ہوئے کہا، "میں جو اپنے آپ پر منکشف ہوں دھیرے دھیرے دھوپ کر شہر پہ پھیلتا جا رہا ہوں اپنی برہنگی سے ڈر رہا ہوں، لوگ مجھے دیکھتے ہی اپنی نگاہوں کی کمندیں پھینک کر میرے دل میں اتر جاتے ہیں ان کی نگاہوں میں سورج کی تیز کرنوں کی شدت اور حدت ہے اور اس تمازت آگہی سے میرا سارا وجود لرز جاتا ہے"۔

انور نے کہا، "پھر بھی لوگ کتنے بے حس ہیں، میرا مطلب یہ ہے کہ ہمارے درمیان ابہام و تفہیم کی ایک بے آواز زبان موجود ہے ہم اس دور میں قطعاً ناگفتہ نہیں ہیں پھر بھی میرے مخالف فرد یعنی میرے مخاطب پہ ردِ عمل کیوں نہیں ہوتا"؟

خالد بولا، "ہوتا ہے مگر منافقت کے دبیز پردے کے پیچھے"۔

دونوں نے اپنے اپنے کپ اٹھائے اور لبوں سے لگا کر چسکیاں لینا شروع کر دیں

مگر انور نے کہا، "تم نے سامنے بھی دیکھا"؟

"کیوں، کیا ہے سامنے، شیشے کی دیوار پہ پردہ پڑا ہوا ہے اور بس"

"مگر پردے کے پیچھے کیا ہے"۔

"شیشے کی دیوار، اور اس کے پیچھے سڑک"۔

"نہیں دیوار اور پردے کے درمیان کوئی ہے"۔

"ہوگا کوئی ویٹر وغیرہ شاید پردے کی سلوٹیں درست کرنے گیا ہو"۔

"ہرگز نہیں، اس کا چہرہ بہت ڈراؤنا ہے کئی بار وہ ہمیں دیکھ چکا ہے"۔

"تمہارا وہم ہوگا ...... شاید تم اونگھ گئے ہو گے"۔

"قطعاً نہیں جناب، میں پوری طرح ہوشیار ہوں اور دیر سے یہی تماشہ دیکھ رہا ہوں"۔

"مگر کون ہو سکتا ہے، وہ اور ہمیں کیوں چھپ چھپ کر دیکھ رہا ہے ہم تو شہر کے کوئی اہم آدمی بھی نہیں ہیں، میرا مطلب ہے کہ ہم سیاسی آدمی تو ہیں نہیں،

ع ہم سے خلاف ہو کے کرے گا زمانہ کیا؟"

"کچھ بھی ہو، وہاں منزور کوئی چھپا بیٹھا ہے اور ہمیں تک رہا ہے۔"

"یار تکنے دو، چھوڑو، کسی اور موضوع پہ بات کرو"

"مگر یہ ہے کون؟"

"وہم، بس کہہ دیا وہم کے سوا اور کون ہو سکتا ہے؟"

"ہاں یہ ہمارے اندر کے اندیشے بھی تو ہو سکتے ہیں جو کوئی نہ کوئی شکل اختیار کر لیتے ہیں، خیر چھوڑو اور بتاؤ کیا سوچ رہے ہو؟"

"یار میں یہ سوچ رہا ہوں کہ ملک میں پہلے ہی بہت بیروزگاری ہے، اب جو بیرون ملک گئے ہوئے لوگ لوٹ لوٹ کر آ رہے ہیں تو ملک کا اور کیا بنے گا بیروزگاری اور کتنے بڑے پیمانے پہ بڑھے گی اور پھر . . . ."

"پھر وہی مسائل . . . . مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو، جہاں تیرا ہے یا میرا۔ یہ مسائل سیاستدانوں کے لیے چھوڑ دو، ہم سیاستدان نہیں ہیں۔"

"مگر ہم اس ملک کے دانشور تو ہیں . ."

"بقلم خود۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ ہم کو دانشور مانتا ہی کون ہے؟ بیوروکریسی نے سیاستدانوں اور دانشوروں کو اپنے دام تزویر میں ایسا الجھایا ہے کہ سیاست بھی انہی کی چلتی ہے اور دانشوری بھی، یہ بادشاہ گر لوگ ہیں ان سے ڈرو۔"

اور دونوں بظاہر ڈر کر جلدی جلدی چائے ختم کرنے لگے۔ پھر انور نے کہا۔

" سنو باہر چلنے سے پہلے ذرا بال روم پہ ایک اچٹتی سی نگاہ نہ ڈال لیں "
خالد نے یوں شانے اچکائے جیسے کہہ رہا ہو کوئی مضائقہ نہیں چنانچہ دونوں
کے دونوں کاؤنٹر پہ بل دیکر نیچے پہنچ گئے جہاں کسی تیز موسیقی کی لے پہ رقص ہو رہا
تھا اور نوجوان جسم لہرا رہے تھے خوشبوؤں کی لپٹیں اڑ رہی تھیں رنگ برنگی لباس
اپنی بہار دکھا رہے تھے اور شوخ جذبات کے تیز اور تند دھاروں پہ نوجوان بہہ
رہے تھے یہاں کسی کو ملکی قومی یا بین الاقوامی مسائل کی مطلقاً کوئی فکر نہ تھی چہروں
پہ کوئی تہ در نہ تھا اور نہ چہروں پہ کل کی فکر کے سائے تھے ہر چہرہ ہشاش بشاش
ہر جسم خوشبوؤں میں ڈوبا ہوا ہر جسم کے ایک ایک اعضاء سے طمانیت اور آسودگی
ابلتی ہوئی محسوس ہوتی تھی ایک خوبصورت نوجوان لڑکی لہراتی بل کھاتی موج
آب کی طرح بہتی ہوئی آئی اور کسی سبک رو کشتی کی طرح انور کو اپنے بازوؤں میں
لئے ہوئے چلی گئی دوسری طرف سے ایک موٹی مگر خوبصورت ادھیڑ عمر کی عورت
کسی ڈبل ڈیکر بس کی مانند ڈولتی ہوئی آئی اور خالد کو کسی بگولے کی مانند کولی میں بھر کر
لے گئی اور لمحے بدلتے روشنی کے زاویوں، موسیقی کی تیز دھنوں اور اڑتی ہوئی خوشبوؤں
کی لپٹوں میں جسم لٹو کی طرح گھوم رہے تھے بھنگی کی طرح ناچ رہے تھے اور مدہوش سے
ہوتے جا رہے تھے بے سدھ اور مگن، تھوڑی دیر کے بعد رقص کا، ایک راؤنڈ
مکمل ہوا، انور اور خالد اس بھیڑ بھڑکے سے نکلے اور چپکے سے باہر نکل کر
کھلی ہوا میں آگئے سڑک پہ سناٹا تھا ٹریفک نہ ہونے کے برابر دور درختوں کے
جھنڈ سے پیلا پیلا چاند ابھر رہا تھا جو بے حد مضمحل اور رنجیدہ مردہ سا دکھائی دیتا تھا
انور بولا " تو یہ لڑکی تھی کہ قیامت، یوں لگتا تھا کہ وینس کو ریشم سے ڈھک دیا گیا ہو
اُف میرے اللہ کیا یہ ہمارے ہی ملک کے لوگ ہیں جنہیں اپنے جسم کے آگے
کچھ نظر ہی نہیں آتا "

"میرے حصے میں ولایتی مگر قیمتی کاسٹمیکس کا پوٹ آیا تھا مگر کیا کہوں مجھے چکر گھنی بنا دیا ظالم نے، وہ مضبوط گرفت تھی اس کے ہاتھوں کی میری کمر کے چاروں طرف کہ جیسے مجھے شکنجے میں کس دیا ہو"

اور ڈیئر خالد، یہ ہمارے ہی ملک کے کسی طبقے کی نیک بیبیاں ہیں"

مگر یہ طبقہ ہے کون ہمارے ملک کی نناوے فیصد بیبیاں کھیتوں اور کھلیانوں میں مشقت کرتی ہیں گھروں میں بچوں کو سنبھالتی ہیں، شوہروں بھائیوں کی نگہداشت کرتی ہیں، اکا دکا فیکٹریوں دفتروں اسکولوں، کالجوں اور اسپتالوں وغیرہ میں بھی کام کرتی ہیں کچھ سیاست میں حصہ لیتی ہیں اور سوشل اداروں میں سر کھپاتی ہیں۔ مگر یہ بیبیاں کون ہیں؟"

"یہ وہی ہیں کہ جن کے شوہر بیٹے اور بھائی دولت تو اس غریب ملک سے بٹورتے ہیں اور یورپ اور امریکہ کے ملکوں میں پانی کی طرح بہاتے ہیں سامان تعیش خریدتے اور عیش کرتے ہیں سارے کالے دھندے چلاتے ہیں سیاستدانوں کو جب چاہتے ہیں خرید لیتے ہیں اور اپنی مرضی کا قانون بنوا کر اپنے حقوق کا تحفظ کرا لیتے ہیں۔ اور جن کے پاس دولت اور روپے پیسے کی فراوانی ہوتی ہے چنانچہ جسم کی آسودگی اور طمانیت کا بھی اور ان کی عورتوں کا بھی واحد مسئلہ ہوتا ہے اور یہی وہ طبقہ ہے جو محنت کشوں کا استحصال کرتا ہے اور اور ۔۔۔"

" اور ہمارے ہنرمندوں اور دانشوروں کی وہ ٹولیاں جو ان کے پیدا کردہ حالات اور مسائل سے دل برداشتہ ہو ہو کر باہر چلی جاتی ہیں ان سے ہمارا ملک اور بھی غریب ہو جاتا ہے، یہی نہیں یہ تو اس مہذب دنیا کے بردہ فروش ہیں سستے داموں پہ مزدوروں کو دوسرے ملکوں میں درآمد کر کے زرمبادلہ کماتے ہیں اور یہ پیسہ بھی ملک میں نہیں آنے پاتا بالا ہی بالا یورپ کے بینکوں میں جمع ہو

ہو جاتا ہے۔"

"یار میں نے بھی فیصلہ کر لیا ہے کہ کینیڈا چلا جاؤں۔"

"کیوں آخر تم کو کیا ہو گیا ہے۔ اچھے بھلے تو ہو یہاں۔"

"ٹورنٹو میں اپنا صبیح ہے نا وہ مجھے ویزا بھجوا دے گا، اسپانسر کر دے گا۔ مزے سے جا رہیں گے۔ نے غم زندو نے غم کالا۔ کسی قسم کا کوئی ٹینشن تو نہیں ہو گا۔"

"ٹینشن وہاں بھی ہو گا۔"

"وہ کیسے۔"

"کالے اور سفید کا ٹینشن۔"

"پھر بھی یار یہ تو نہیں ہو گا جو یہاں ہے۔"

"ٹھیک ہے یہاں حالات اچھے نہیں، مگر ہے تو یہ اپنا ہی ملک۔"

"دیکھو یہ سڑک جس پہ ہم تم کھڑے ہیں پتہ ہے اس سڑک پہ میں کب سے چل رہا ہوں۔ پورے چالیس سال سے، یعنی جب سے میں نے چلنا سیکھا۔ یہ سڑک میری ہمراز اور دمساز ہے۔"

"یار اس سڑک سے بھلا ان باتوں کا کیا رشتہ۔"

"ہے رشتہ۔"

"وہ کیسے۔"

"وہ ایسے کہ چالیس سال سے مسلسل میں اس پہ پیدل چل رہا ہوں جبکہ کتنے ہی پیدل چلنے والے گاڑیوں پہ چلنے لگے جہازوں پہ اڑنے لگے سینکڑوں ایسے ہیں کہ سال میں کتنی ہی گاڑیاں بدل دیتے ہیں اور اس سڑک پہ دندناتے پھرتے ہیں اور میں ہوں کہ اسی طرح چالیس سال سے رینگ رہا ہوں اور دس بیس سال تک اس پہ گھسٹتے گھسٹتے میں قبر میں پہنچ جاؤں گا اور مجھے گاڑی نصیب نہیں ہو گی۔"

"یہ بھلا کیا بات ہوئی گاڑی کونسا بڑا مسئلہ ہے جس کی خاطر تم وطن چھوڑ دو گے"۔

"مسئلہ نہیں تھا بنا دیا گیا ہے، معاشرے میں عزت کا نشان ہے۔ . . . اور پھر ذرا سوچو، میں ایک کوالیفائڈ آدمی ہوں، دانشور ہوں، کچھ کتابوں کا مصنف بھی ہوں، مگر میری عزت؟ ؎

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں
اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی"

"خیر کچھ بھی کہو، مجھے تمہارے اس فیصلے میں خاصا بچپنا نظر آتا ہے"۔

"آتا ہوگا۔ . . . مگر میں بھی انسان ہوں تھوڑا سا آرام اور تھوڑی سی عزت چاہتا ہوں اس دنیا میں دوبارہ نہیں آنا ہے کیا کروں"۔

اچانک دونوں پہ خاموشی نے حملہ کر دیا جیسے وہ اپنے اندر ڈوب گئے ہوں۔ جیسے وہ اپنے باطنی وجود سے مخاطب ہوں اور ایک دوسرے کی رفاقت سے تھک گئے ہوں انور نے معاً موضوع بدلنے اور خاموشی کے بوجھ کو اتارنے کے لئے خالد سے کہا، "چاند کیسے چپ چاپ سفر کر رہا ہے اور ازل سے اب تک سفر ہی کی حالت میں ہے؟"

"کیونکہ وہ تنہا ہے"۔

"ہم سب اپنے اندر تنہا ہیں"۔

"یہ ہم کیوں تنہا رہ گئے ہیں۔ کیا ہر معاشرے کا انسان اسی طرح تنہائی کے زہر کو پی رہا ہے"۔

"نہیں، جب معاشرے کے تانے بانے ٹوٹ جاتے ہیں اور معاشرے کے سفر کی مقصدیت ختم ہو جاتی ہے، کچھ اجارے دار لوگوں کے اشارے پہ معاشرے کے اندر حرکت کرنے لگتے ہیں اور معاشرے کا رس نچوڑ کر اپنا گلاس بھر لیتے ہیں۔ تو باقی افراد معاشرہ کے حصے میں صرف پھوک رہ جاتا ہے اور معاشرے کے حرکات میں

INVOLVE نہیں ہو پاتے تو تنہا رہ جاتے ہیں اور جب معاشرے کے افراد تنہا رہنے لگتے ہیں تو زندگی بے مقصد فضول اور بے معنی نظر آنے لگتی ہے"

"تو یہ ہپیز وغیرہ بھی "

ہاں ہاں اپنے معاشرے کی رو سے کٹے ہوئے ہیں یہ لوگ، بیمار ہیں یہ کہا جاتا ہے نا، لیکن حقیقتاً بیمار یہ نہیں ہیں، ان کا معاشرہ بیمار ہے یہ تو اس معاشرے کا ناسور ہیں"

"تم ٹھیک کہتے ہو، شاید ہمیں ماہرین عمرانیات کی خدمات حاصل کر کے اپنے معاشرے کا علاج ڈھونڈنا چاہیئے"

علاج تو ڈھونڈا جا چکا ہے ہر زمانے میں ڈھونڈا گیا اور پایا گیا، مگر اس پر عملدرآمد کہاں ہوتا ہے کیا میں علاج ڈھونڈنے والے موسیٰؑ کا نام لوں ابراہیمؑ کا نام لوں گوتم اور سقراط کا نام لوں، محمدؐ کا نام لوں، حسینؑ کا نام لوں اور — اور ہاں کتنے سراج الدولہ، ٹیپو، لکشمی بائی، حضرت محل اور بخت خاں ہوئے ہیں ہماری تاریخ میں"

"اور ہر ایک کا راستہ روکا ہے فرعون نے نمرود نے، ابو جہل، یزید اور جعفر و صادق نے —"

"ہنھ"

"تو وہ آدمی؟"

"کون؟"

"وہی جو ریستوران میں پردے کے پیچھے نظر آیا تھا کون تھا وہ؟"

"اُف بھئی"

"سوچنا پڑے گا بہت گھمبیر مسئلہ ہے"

تاریخ کے موڑ پر ہوں نہ ہوں البتہ اپنے راستے کے اہم موڑ پر ضرور کھڑے ہوئے ہیں"

دونوں نے غور کیا تو وہ باتیں کرتے ہوئے اس مقام پر پہنچ چکے تھے۔ جہاں سے دو راستے مختلف سمت میں مڑتے تھے ایک شمال میں ایک جنوب میں اور رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی دونوں نے گھڑیوں پر نظر ڈالی مصافحہ کیا اور ایک دوسرے سے رخصت ہو کر مختلف سمتوں میں چل پڑے کچھ ہی دیر بعد ایک نے معاً مڑ کر پیچھے دیکھا اور ٹھہر گیا اور جب اسے یقین ہو گیا کہ دوسرا مخالف سمت کے کھلار میں اتر کر دور جا چکا ہو گا تو وہ مڑا اور ایک اور سمت میں چلنا شروع کیا درختوں کے کنجوں میں ایک سایہ سا نظر آیا اس نے اس سائے کا تعاقب کیا لیکن دھیرے دھیرے آہستہ آہستہ پیروں کی چاپ سنائی نہ دے پھر اس نے دیکھا کہ سایہ حرکت کرتا ہوا سڑک پر واپس آ گیا اس نے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف بلند کئے اور پھر لمبا لمبا سڑک پر لیٹ گیا اور سسک سسک کر رونے لگا رونے والے تک پہنچ کر اس نے اس کا چہرہ اٹھایا اور حیرت سے کہا، تم!

وہ بولا ہاں میں ہوں، میں ابھی تک واپس نہیں گیا تھا سڑک کی چھاتی کے نیچے اس کے دھڑکتے ہوئے دل کی کراہیں سن رہا تھا، بہت زخم ہیں، صدیوں اور قرنوں سے زخم سہ رہی ہے بیچاری۔ مگر۔ مگر تم تو واپس چلے گئے تھے،،

"میں میں،، وہ ہکلایا،،، در اصل میں سمجھا کہ وہ جو سایہ ریستوران میں نظر آیا تھا کہیں تم وہ ہی تو نہیں ہو؟"

کرسٹوفر[1]

میں علم الانسان[1] کا طالب علم ہوں، ماضی کے انسانوں کے بارے میں معلومات اکٹھا کرنے کے مختلف النوع ماخذ دریافت کر کر کے کتابیں لکھتا ہوں، اور نت نئے شوشے چھوڑتا رہتا ہوں تاکہ دنیا کے دانشوروں کو حیران کرتا رہوں اور اپنی دکان چمکاتا رہوں جس سے مجھے شہرت کی دولت بھی ملتی رہے اور سچ مچ کی دولت بھی بہم پہنچتی رہے ساتھ ہی ساتھ میری تسکین نخوت کا سامان بھی مہیا ہو رہا ہے چنانچہ جب میں نے اس خیال سے ایک انسانی کھوپڑی کو دریافت کیا کہ اس کا قرون وسطیٰ کے زمانے سے تعلق ہو گا اور میں اس کے باب میں اہم انکشافات کر کے دنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈال دوں گا تو معاً آنکھوں کے راستے پہ ایک چیونٹی نمودار ہوئی جو نہی میں نے

---

[1] سینٹ کرسٹوفر کے متعلق بہت سی روایتیں بیان کی جاتی ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ حضرت عیسیٰؑ کو ایک بار دریا کے اس پار لے گئے تھے چنانچہ ان کا یہی نام پڑ گیا (یونانی زبان میں کرسٹوفروس کا مطلب ہے کہ عیسیٰؑ کو لے جانے والا) بعض روایات کے مطابق کرسٹوفر کتے کی شکل کے ایک دیو تھے بپتسمہ کے بعد ان کے خدوخال انسان کے ہو گئے بعض روایات یوں ہیں کہ وہ غیر معمولی حسین، خوب صورت اور وجیہہ انسان تھے اور جنس مخالف کے لئے بڑی کشش رکھتے تھے ترغیبات جنسی سے بچنے کے لئے انہوں نے اللہ سے دعا کی کہ انہیں محفوظ رکھا جائے دعا قبول ہوئی چنانچہ عورتوں کو ان کے دھڑ پہ کتے کا سر نظر آتا تھا اور اس طرح وہ عورتوں سے محفوظ ہو گئے یونانی گرجوں میں انکی شبیہہ اسطرح محفوظ کی گئی ہے (دیکھئے یونیسکو کا پیامی مارچ ۱۹۷۷ء سال اوّل شمارہ ۲ سرورق کا صفحہ ۲)

[1] ANTHROPLOGY

چاہا کہ چیونٹی کو پھونک مار کر گرا دوں - وہ فوراً کھوپڑی کے اندر دبک گئی۔ مشکل یہ تھی کہ کھوپڑی اس قدر خستہ تھی کہ ذرا سی جھاڑ پونچھ سے ہڈی کے ذرات ضائع ہو جانے کا احتمال تھا نہ کپڑے سے اسے رگڑا جا سکتا تھا نہ برش پھیر کر اسے صاف کیا جا سکتا تھا چنانچہ میں نے یہی مناسب سمجھا کہ چیونٹی کے دوبارہ نمودار ہونے کا انتظار کیا جائے: چیونٹی کو جیسے میرے ارادے کی خبر ہو چکی تھی لہٰذا وہ بھی مزے سے دبکی بیٹھی رہی، جیسے ہوائی حملے کا سائرن سنتے ہی لوگ پناہ گاہوں میں جا کر چھپ رہتے ہیں میں حیران تھا کہ اتنی سی چیونٹی میرے ارادے کے خطرناک پہلو کو کیوں کر بھانپ گئی اور ننھی سی چیونٹی کی ننھی سی جبلت نے اسے کیونکر اپنے تحفظ کا گر سکھا دیا پھر میں نے غور کیا کہ چیونٹی نے ضرور اس خاکدان استخوان میں کوئی نہ کوئی سوراخ چن رکھا ہو گا رات زیادہ ہوتی جا رہی تھی ایک دل نے کہا کہ چھوڑو بھی باقی تحقیقات کل پر اٹھا رکھو مگر پھر اسی لمحے دوسرے دل نے کہا کہ کل ہماری زندگی میں نہ آ سکا اور یہ تحقیق دریافت نہ ہو سکی تو ممکن ہے کہ انسان کے ارتقا کی تاریخ میں یہ کمی رہ جائے اور پھر ممکن ہے کہ مستقبل کا کوئی انسان میری کھوپڑی کو سامنے رکھ کر وہ بات دریافت کرنا چاہے جو اس وقت میرے ذہن میں رینگ رہی ہے اور دونوں دریافتوں کے مابین زمان و مکان کا فاصلہ کئی صدیوں اور قرنوں پر محیط ہو اور وہ نکتہ آئندہ زمانے کے انسان کے لئے فرسودہ ہو چکا ہو۔ لہٰذا کل کے بجائے آج ہی سارا کام کیا جانا چاہیے۔

سونا چاہیے نیند آ رہی ہے۔

نہیں، جاگنا چاہیے اور اپنا فرض بجا لانا چاہیے سونا ہرگز مناسب نہیں۔

نہیں، سونا چاہیے، نیند کا غلبہ بڑھ رہا ہے پپوٹے بھاری ہو رہے ہیں جماہیاں آ رہی ہیں مگر فرض — سونا — جاگنا — شاید میں سو گیا، یا شاید نہیں سویا لیکن کچھ تو ہوا کہ ذہن میں ایک زوردار دھماکہ سا ہوا اور معاً دھواں سا پھیل گیا اور میں

دھند کے گہرے سمندر میں غوطے کھانے لگا کبھی پاتال میں دھنستا چلا جاتا کبھی
اوپر کی طرف اٹھتا چلا جاتا اسی اثنا میں میں نے دیکھا کہ ہزاروں چیونٹیاں سنہری پروں کو
ہلا ہلا کر اڑ رہی ہیں ان کے پنکھ نہایت خوبصورت ہیں اور اڑنے کی رفتار نہایت
تیز ہے پھر یوں ہوا کہ خوب صورت پروں والی چیونٹی میری ناک پر آ کر بیٹھ گئی اور
پاؤں اور ہاتھ ہلا ہلا کر مجھ سے کچھ کہنے کی کوشش کرنے لگی اگرچہ اس کی نسائی آواز میں
موسیقیت اور غنائیت کا جادو موجود تھا جس میں سحر چھپا ہوا تھا جس سے میں خود بخود
مسحور اور مبہوت ہو رہا تھا لیکن چیونٹی کی زبان مطلقاً میرے پلے نہ پڑی میری
کم فہمی کو دیکھ کر چیونٹی ہنسی اور معاً اس نے دستک دی جسے سن کر آس پاس
اڑنے والی چیونٹیوں نے قطار بنا کر مجھ پر گرنا شروع کر دیا جو چیونٹی مجھ پر گرتی
ایک حسین پری کا روپ دھار لیتی دیکھتے دیکھتے میں حسینوں کے جھرمٹ میں پہنچ
گیا اور پھر ایک زوردار دھماکہ ہوا تو میں نے دیکھا کہ خوب صورت بارہ دری
بنی ہے سنگ مرمر کے خوبصورت حوضوں میں فوارے چھوٹ رہے ہیں باریک
پردے دروں پر پڑے فرحت زا ہوا سے ہلکورے لے رہے ہیں مسندیں
لگی ہیں اور صدر نشین میرے ہمراہ ایک مہ وش ہے اور پریوں کا رقص ہو رہا ہے
پھر نہ معلوم کیا ہوا کہ وہ مہ وش بھی اٹھ کر رقص کرنے لگی۔ مجھے بھی دعوت دی۔
میں جونہی اٹھا کہ اسے تھام کر محو رقص ہو جاؤں کہ کسی نے گرج کر کہا کہ خبردار اس
پری کو ہاتھ نہ لگانا ورنہ پتھر کے ہو جاؤ گے میں نے غور کیا تو تمام پریاں تھر تھر کانپ
رہی تھیں اور میرے جسم میں بھی رعشہ پڑا ہوا تھا بارہ دری کے در و دیوار لرز
رہے تھے، پھر مجھے خیال آیا کہ یہ تو میں بالکل کسی داستانی فضا میں پہنچ گیا ہوں
کہیں یہ سب فریب نظر تو نہیں لیکن فوراً ایک زوردار دھماکہ پھر ہوا اور
آسمانوں سے ایک انسانی کھوپڑی اتر کر میرے ہاتھوں میں پہنچ گئی اور اس کے

آنکھوں کے خلاء سے ایک چیونٹی نمودار ہوئی اور لوٹ پوٹ کر ایک شہزادی بن گئی اور اس شہزادی نے کہا کہ اے شخص میں زندگی ہوں میں نے کہا کی زندگی موت سے مغلوب ہو کر بن گئی تھی کیا موت نے زندگی کو ختم نہیں کیا۔ زندگی ہنسی اور بولی میں وہ زندگی نہیں ہوں جو تحلیل ہو کر غائب ہو جاتی ہے میں امر ہوں میں کبھی نہیں مرتی پھر میں نے کہا کہ مگر اس کھوپڑی کی ہڈیاں خشک ہو کر جھڑ رہی ہیں اور اس کے ذرات تک بکھرنے والے ہیں میں تو ان کے بکھر جانے سے پہلے تاریخ مرتب کرنا چاہتا ہوں، زندگی مسکرائی اور بولی ذرا غور سے دیکھو، میں نے کھوپڑی کو پھر غور سے دیکھا تو معاً اس پہ گوشت پوست چڑھنے لگا رنگ و روغن بھرنے لگا اور دیکھتے دیکھتے وہ کھوپڑی ایک حسین و جمیل خوش پوش نوجوان بن گئی لیکن یہ نوجوان اپنے لباس کے لحاظ سے بالکل اجنبی تھا قرون وسطیٰ کے یونانی لباس میں وہ ایسا جاذب توجہ تھا کہ پریاں ٹوٹ ٹوٹ کر اس پہ گرنے لگیں اور وہ حواس باختہ ہو کر ادھر ادھر چھپتا پھرتا تھا مگر ان پری بیکروں اور مہ وشوں نے کچھ اس طرح اسے چاہا کہ بیچارہ سجدے میں گر کر گڑگڑانے لگا اے اللہ مجھے اس مصیبت سے بچا۔ میری حفاظت کر۔ فوراً اس کا چہرہ بدلا اور خوبصورتی مسخ ہوئی اور وہ کتے کی شکل اختیار کر گیا۔ گو جسم انسان کا رہا مگر چہرہ کتے کا بن گیا۔ میں نے کہا اے نوجوان یہ کیا، بولا، اے شخص اب میں وہ ہوں کہ جو میں ہوں مگر نظر وہ آ رہا ہوں کہ جو نہیں ہوں، میں نے پوچھا کہ تو کیا تم کتے نہیں ہو، وہ بولا نہیں میں انسان ہوں مگر طمع اور حرص کی نگاہ مجھ پہ پڑتی ہے تو میرے چہرے کے آئینے میں اپنا ہی چہرہ دیکھتی ہے اور یہ سمجھتی ہے کہ یہ میں ہوں، گو میں نہیں ہوں اور فی الحقیقت یہی ہوا کہ پری وش اسے دیکھ دیکھ کر گھن کھائیں اور اس کا پنڈ چھوڑ جائیں، دیکھتے دیکھتے وہاں سناٹا ہو گیا اور نوجوان بولا دیکھا کیسا بچ دیا کیسی جان بچائی، میں بولا بھئی یہ نقاب تو اچھی تمہارے ہاتھ آئی جب چاہا

چڑھالی اور اپنی صورت مسخ کرلی، نوجوان ہنسا اور میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر ٹہلنے لگا، پھر اس کے قدم خود بخود تھرکنے لگے اور ہم دونوں رقص کرنے لگے زور زور سے ناچنے لگے اور دائرے بنا بنا کر خوب ناچنے لگے کہ اچانک میرا دماغ چکر گھنی بن گیا۔ لٹو کی طرح ناچنے لگا۔ اور پھر مجھے اتنے زور کا چکر آیا۔ کہ میں دھم سے گر پڑا اور کھوپڑی میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ میری آنکھ کھل گئی کھوپڑی سچ مچ زمین کے فرش پر گر کر ریزہ ریزہ ہو چکی تھی میں نے روشنی میں غور سے دیکھا تو زمین کے جس فرش پر کھوپڑی گری تھی اس پر میری ہی سرزمین کا نقشہ کندہ تھا۔ اور جا بجا چیونٹیاں رینگ رہی تھیں۔ اتھاہ چیونٹیوں کا ریلا کہیں سے آگیا تھا۔ جس نے تمام نقشے کو سیاہ کر دیا تھا۔ ایسا سیاہ کہ کھوپڑی کے ذرات تک ان میں چھپ گئے۔

لمن الملک الیوم

اندھیری رات میں ہاتھ کو ہاتھ نہیں سوجھتا تھا کہ ایک تو اماوس اوپر سے گھٹا ٹوپ گھٹا، گھنگھور گھٹا، نہ برستی تھی نہ کھلتی تھی۔ بس چاروں کھونٹ ڈیرے ڈالے پڑی تھی ہوا بھی کیا مجال ذرا سی سنک جائے، حبس سا حبس تھا۔ زینت محل کی کنیز نہایت ادب سے فراشی پنکھا جھل رہی تھی مگر زینت محل کی آنکھوں سے نیند کافور ہو چکی تھی۔

"ملکۂ عالم آرام فرمائیں کنیزیں حاضر ہیں،،

ملکۂ عالم نے فرمایا" اے بیدار بخت تجھے خبر ہے، بخت خان نے قلعۂ مبارک سے فرنگیوں کو بے دخل کرنے کے بعد شہر دہلی ان سے خالی کرا لیا۔ ہڈسن اور مٹکاف کی فوجیں شہر کے باہر نکال دی گئیں اور بخت خان کے لشکر نے فرنگی فوج کا محاصرہ کر کے رسد رسانی بند کر دی۔"

کنیز بولی، ملکۂ عالم کا اقبال بلند ہو، رعایا ملک و مال کو دعائیں دیتی ہے۔ نمک اور شکر پر محصول معاف ہوا، نرخ ارزاں ہو گیا۔ لوگ جشن منا رہے ہیں"

ملکۂ عالم نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور کہا" اے بیدار بخت فرنگی کی چالوں کو تو نہیں سمجھ سکتی ہماری جیتی ہوئی بازی کو پلٹنا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ یہ محاصرہ ریت کی دیوار کی طرح ڈھ سکتا ہے۔ ظل اللہ کو دن رات یہی تردد کھائے جاتا ہے اندر سے میرے کلیجے کو رہ رہ کر کوئی مسوستا ہے کہ کہیں خدانخواستہ۔

کنیز نے کہا: "خدانخواستہ ملکۂ عالیہ تردد نہ فرمائیں، انشاءاللہ سب ٹھیک ٹھاک

رہے گا۔

ملکہ عالیہ نے کہا، "کیسی ڈراؤنی رات ہے۔"

کنیز بولی: "ملکہ عالم سارا آسمان سیاہ گھٹا سے ڈھکا ہوا ہے۔"

ناگاہ ایک کنیز شمع کا کنول لیے ہوتے حاضر ہوئی اور آہستہ سے عالم پناہ کی آمد کا اعلان کیا، عالم پناہ سیاہ فرغل میں ملبوس سر برہنہ تشریف فرما ہوئے ملکہ عالم نے اٹھ کر استقبال کیا کنیزیں رخصت ہو گئیں۔

"بنصیب دشمناں مزاج تو ناساز نہیں۔"

"ظل اللہ نے فرمایا۔" زینت محل کچھ ہونے والا ہے، میرے جد اعلیٰ جنت مکانی شہنشاہ اعظم حضرت شاہجہان ابھی ابھی خواب میں پریشان حال تشریف لائے اور فرمایا کہ اے فرزند جان لے کہ بربادی اس قوم کا مقدر ہے کہ جس کے دانشور کو تہہ تیغ کیا جائے، بندی خانوں میں انہیں ڈال دیا جائے اور ان پہ ناسمجھ اور کم سواد حکمراں بٹھا دیئے جائیں۔"

زینت محل نے عرض کی۔ "اے عالی جاہ یہ آپ کیا فرماتے ہیں، آپ کے دور میں دانش و بینش کی حکمرانی ہے۔"

ظل اللہ نے فرمایا۔" اے زینت محل ہماری کیا خاک حکمرانی ہے، ہم پر تو فرنگی حکومت کرتا ہے۔"

زینت محل نے کہا۔" اللہ نے چاہا تو اس کا قلع قمع ہو جائے گا، محاصرہ سخت ہے رسد رسانی موقوف۔"

ظل اللہ ایک آرام دہ کرسی پہ تشریف فرما ہو گئے اور نہایت تاسف سے بولے: زینت محل ہم کیا اور ہمارا محاصرہ کیا چہ پدی و چہ پدی کا شوربہ، بخت خان سرفروش ہے اس کا لشکر بھی وفادار ہے مگر غدار تو ہماری ہی صفوں

میں موجود ہیں حضرت جنت مکانی کی یہ پریشانی بے معنی نہیں،"

زینت محل نے بات کا رخ بدلنے کے لئے کہا "کیسی اندھیری اور بھیانک رات ہے"

"کاش،" ظل اللہ بولے "یہ اندھیری رات ہمارے ملک کیلئے ایک نئی نوید لے کر آئے"

"مزاج عالی پہ تردد کا غلبہ ہے کیوں نہ کسی مغنیہ کو طلب کر کے کوئی طرب انگیز نغمہ سماعت فرمایا جائے"

"نہیں نہیں زینت محل" عالی جاہ بولے "کسی بات میں دل نہیں لگتا، عجیب سی گھٹن کا احساس بڑھتا جا رہا ہے، مغل فوجوں میں حکمرانی کا غرہ بڑھتا جا رہا ہے لڑنے کی صلاحیت ختم ہوتی جا رہی ہے دوست دشمن کی تمیز مٹتی جا رہی ہے۔ مرزا مغل کو بخت خان سے جشمک ہے مغل فوج کو پوربی سرفروشوں پہ بھروسا نہیں یہ فوج الگ ہوئی اور فرنگی نے ہمیں دبایا، مگر کسی کو ہوش نہیں، زینت محل، میں سب کچھ دیکھ رہا ہوں، مجھے بربادی کے آثار۔"

"خدانخواستہ" زینت محل نے پھر موضوع بدلنے کے لئے ظل سبحانی کی توجہ دوسری طرف لگانے کے جتن کئے

"ظل اللہ کے اجداد نے کبھی ہمت نہیں ہاری بڑے بڑے معرکے سر کئے، یہ تو معمولی سا قصہ ہے"

"نہیں زینت، یہ معمولی قصہ نہیں ہے تاریخ کا اہم موڑ ہے۔ تلوار چلانا، گھوڑے دوڑانا قلعے فتح کرنا فوجوں کی کمان کرنا یہ بہت معمولی باتیں ہیں بہت ہی معمولی"

"پھر اہم کیا ہے شطرنج کھیلنا"

"شطرنج کھیلنا زیادہ اہم ہے، چال جب تک اپنے ہاتھ میں رہے تو

بڑی بات ہے چال ہاتھ سے نکل جائے تو۔ زینت ہمارے ہاتھ سے چال نکل چکی ہے اور ہماری چال کسی اور کے ہاتھ میں ہے، وہ جو اس کا اہل نہیں ہے یہی تو بات ہے کہ حضرت جنت مکانی متردد ہو کر خواب میں چلے آئے"۔

"خواب تو میں نے بھی دیکھا تھا۔ مگر ڈر کے مارے بیان نہیں کرتی"۔

"کیا خواب تھا۔ بیان کرو، ہم ہمہ تن گوش ہیں"۔

"بڑا خواب تھا، ظل اللہ کو تکدر ہوگا"۔

"نہیں زینت محل، ارادے جیسے ٹوٹ رہے ہیں اپنی بیجان بڑھ رہی ہے"۔

"میں نے دیکھا کہ دلی تاراج پڑی ہے۔ جگہ جگہ خون کے دریا بہہ رہے ہیں۔ لوگ صلیبوں پہ لٹک رہے ہیں، گھروں میں کہرام بپا ہے اور آگ کے شعلے آسمانوں سے باتیں کر رہے ہیں سر بریدہ شہسواروں سے شہر اٹا پڑا ہے اور صلیبوں پر چڑھے ہوئے مردہ انسانوں کے منہ سے نور کی ندیاں بہہ رہی ہیں سر بریدہ شہسواروں کے ہاتھوں میں تلواریں نہیں ہیں، سیاہ علم اور چمڑے کے دُرّے ہیں"۔

"اللہ اکبر"، ظل اللہ نے فرمایا "یہ کیا ہو رہا ہے ہم یہاں کیسے عالم جبر میں ہیں ـ اور جبر کا شکنجہ کس قدر مضبوط ہے اور ہمارے گرد اس شکنجے کا حصار تنگ ہوتا جا رہا ہے"۔

ظل اللہ شعر ہیں کیا شعر گوئی سے جی نہیں بہلتا"۔

"نہیں زینت ان دنوں کچھ نہیں بھاتا۔ دلی کا درد دل کو لگا ہوا ہے۔ دماغ کو فکر کی دیمک چاٹ رہی ہے تن کے صحرا میں بگولے اٹھ رہے ہیں کوئی نہیں، کوئی نہیں بچا سکتا"۔

"مگر ظل سبحانی، ہماری گرفت بہت مضبوط ہے"۔

"زینت، جس گرفت کو میں محسوس کر رہا ہوں اسے کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ میں

کس قدر مجبور ہوں، کیسا اندوہناک اندھیرا چھایا ہوا ہے کہ ہاتھ کو ہاتھ نہیں سوجھتا
سارا آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا ہے ایک بھی تارا نظر نہیں آتا اتنی سی بھی روشنی
نہیں کہ روح کا طائر جو بدن کے اندھیرے قفس میں پھڑپھڑا رہا ہے پرسکون
ہو سکے بس ہر وقت روح کے لبوں پہ ایک ہی فقرہ سنائی دیتا ہے کہ کچھ ہونے والا ہے

زینت محل نے ظلِ سبحانی کو سہارا دیکر ایک صوفے پہ بٹھا دیا اور ریشمی پردے
کلابتو کی ڈوریوں سے کھینچ دیئے۔

"حضرت نظام الدینؒ کے مزار پہ سنا جاتا ہے کہ کوئی فقیر بیٹھا کہہ رہا ہے اے لوگو!
تمہارے ساتھ دغا ہونے والا ہے تمہارے درمیان میں دغا باز موجود ہیں"

"زینت محل! وہ فقیر سچ کہہ رہا ہے۔ مجھے مرزا الٰہی بخش اور حکیم احسان اللہ
کی باتوں میں۔۔۔۔"

"اے خدا نخواستہ — یہ ظل اللہ کا وہم ہے حکیم صاحب تو بڑے اللہ والے آدمی
ہیں اور مرزا صاحب تو ہمارے سمدھی ہیں"

"زینت تم کس فریب کا شکار ہو۔ تمام رشتے دولت سے ناپے جاتے ہیں
یہ رشتے بھی"

"مجھے باور نہیں ہوتا" زینت محل بولیں۔

پھر حضرت جنت مکانی کا خواب آنا فقیر کی زبان پر یہ بشارت کی باتیں، کیا
ہے یہ سب؟ میرے کانوں میں کوئی چیخ چیخ کر یہ کہہ رہا ہے کہ یہ سچ ہے یہ سچ ہے"

"بے شک تخت و تاج کا غم بہت بڑا ہے۔

"زینت، تخت و تاج کی بات نہیں، ظالمانہ حکومت کے آنے کا خدشہ ہے
کیا ہم سراج الدولہ کو بھول سکتے ہیں، کیا حیدر علی اور ٹیپو کو بھلا دیں۔ کیا
واجد علی شاہ کی معزولی فراموش کر دیں اور پھر کیا ہوا لوگوں کے ساتھ کیا سلوک

کیا گیا، زینت محل، میں نہیں بھولا، میں نہیں بھول سکتا۔

ظلِ سبحانی کو بہت زیادہ تکلیف ہے۔ خدانخواستہ مزاج ناساز ہو جائے، حکیم صاحب شب بیداری کی ممانعت کر چکے ہیں"

اندھیری رات میں ہاتھ کو ہاتھ نہیں سوجھتا، ایک تو اماوس اوپر سے گھٹاٹوپ گھٹا، گھنگھور گھٹا، نہ برستی تھی نہ کھلتی تھی، بس چاروں کھونٹ ڈیرے ڈالی پڑی تھی۔ ہوا بھی کیا مجال کہ ذرا سنک جائے حبس، سا حبس تھا لال قلعے کے ایک حجرے میں ٹاٹ کے پردے کے پیچھے زینت محل اور بہادر شاہ ایک چٹائی پر بیٹھے تھے نیند آنکھوں سے کافور ہو چکی تھی۔

"اس نے تو کہا تھا کہ ہمارے ساتھ چلیے ہم ایک محاذ پہ شکست کھا گئے تو کیا ہوا دوسرا محاذ تو ہے، ہم اودھ کے محاذ پہ لڑیں گے"

زینت محل نے کہا، ظلِ سبحانی نے سن کر قدرے توقف کیا اور پھر دھیرے دھیرے بولے۔

"ہاں" ایک اور طویل ٹھنڈی سانس کے بعد پھر رک رک کر کہا "اس نے تو کہا تھا، ہم نے چاہا بھی تھا مگر۔ مگر مشورے کی ڈور حکیم احسن اللہ اور مرزا الٰہی بخش کے ہاتھ میں تھی اور ان کی ڈور مٹکاف اور ہڈسن کے ہاتھ میں۔

سنا ہے شہر میں قتلِ عام ہوا لوگوں کو پھانسیاں دی گئیں، گھروں میں آگ لگائی گئی کوئی زندہ سلامت نہ بچ سکا سوائے ان کے جو بھاگ نکلے"

"ایسا ظلم کبھی نہیں ہوا"

"اودھ میں کوئی حضرت محل ہے، خوب لڑ رہی ہے سنا جاتا ہے۔ بخت خان بھی وہاں پہنچ گیا ہے"

جھانسی میں لکشمی بائی بھی ہے۔ مگر فائدہ؟ کچھ نہیں ہوگا، دیکھ لینا کچھ نہیں ہوگا"

"کیوں آخر، کچھ تو ہونا چاہیئے"۔

"لوگوں میں حوصلہ ختم ہوگیا ہے مایوسی چھائی ہوئی ہے"۔

اور ہمارا انجام؟"

"موت، خواہ طبعی خواہ غیر طبعی۔ زینت، موت کا آنا برحق ہے۔ مگر عزت کی موت ہمیں زندہ رکھ سکتی ہے"۔

"سنا ہے کہ ولایت ولایت اخبار چھپے ہیں کہ ہم غدار ہیں"۔

"شاید ہے"۔

"کیا ہم غدار ہیں؟"

"نہیں، تاریخ ظلم کے ہاتھ سے نہیں لکھی جاتی، تاریخ ہمیں غدار نہیں لکھ سکتی، خدا گواہ ہے کہ ہم نے ملک کو اور ملک کے لوگوں کو ابتلا سے نکالنے کی سعی کی تھی مگر ہمارے ہی دوستوں نے دغا کی"۔

"ہڈسن ہم پر مقدمہ چلا رہا ہے، جھوٹا مقدمہ یہ کیسا ستم ہے"۔

"زینت، ہر دور میں ایک کربلا بنتی رہی ہے۔ ہر دور میں حسین شہید ہوتے رہے ہیں اور معصوم یا بچہ لال بندی خانوں میں ڈالے جاتے رہے ہیں، مجھے دکھ مرنے کا نہیں ہے لوگوں کی تباہی ملک کی غارت گری کا قلق ہے کہ یہ سب کچھ دوستوں کی دغا سے ہوا"۔

"ہم جب تک زندہ رہیں گے ہمیں یہی قلق رہے گا"۔

"ہمارا قلق، ہمارا صدمہ، ہواؤں اور فضاؤں میں گونجتا رہے گا، ہماری آہیں ہماری فضائیں باد صبا دور دور تک پہنچا دے گی۔ اور آنے والا دور ثابت کرے گا کہ غدار کون تھا؟"

"ذرا چپکے رہیئے اور غور سے سنیئے"۔

"کیوں؟"

"شاہ برج میں پھر آواز گونجی۔"

"کیسی آواز؟"

"رات کے سناٹے میں شاہ برج میں کوئی آواز گونجتی ہے جو قلعے کے گنبدوں سے ٹکراتی ہے" سنیئے۔"

"کیا آپ نے سنا؟"

"ہاں سنا، مگر کاش وہ بھی سنیں۔"

"کون؟"

"جنہیں سننا چاہیئے۔"

وہ بھی سنیں گے ضرور سنیں گے، کان لگایئے دیکھئے کیسی گونج ارہا ہے ہوا کی آواز میں کیسا صاف سنائی دے رہا ہے۔"

"کہیں ہمارے کان تو نہیں بج رہے ہیں، کہیں ہمارے دل کی گہرائیوں سے تو یہ آواز نہیں نکل رہی ہے۔"

نہیں نہیں یہ تو آواز ہے، یہی آواز تو سچائی ہے اور سچائی ہر دور میں سنی جا سکتی ہے، دیکھئے وہ پھر گونجی ہے نا۔"

"ہاں ہاں بہت صاف آرہی ہے۔"

"وقت اُٹھے گا"

کیا تم نے آج کا — اخبار پڑھا

نہیں

کیوں ؟

اس لئے کہ — اخبار — ابھی تک بالغ ہی نہیں ہوا۔

کیا مطلب ،

مطلب یہ کہ ہمارے گاؤں کا ایک زمیندار تھا۔

زمیندار تھا — ؟ ارے بھئی زمیندار سے اور اخبار سے کیا مطلب ؟

مطلب ہے، اور وہ یہ کہ وہ اپنے گاؤں کے کسی شخص کو تعلیم نہیں حاصل کرنے دیتا تھا

کیوں ؟

اسی لئے کہ جو وہ جانتا ہے وہ سب جاننے نہ لگیں، اور جو جاننے لگیں وہ اسے ماننے سے انکار کر دیں، اور یوں اس کی چودھراہٹ خاک میں مل جائے۔

پھر

پھر یہ کہ - اخبار بھی یہی چاہتا ہے اور اپنے قارئین کو اصل تعلیم سے دور رکھتا ہے کہ کہیں اس کی چودھراہٹ ختم نہ ہو جائے - وہ اس سائنس اور صنعت کے دور میں بھی حقائق پر بیر وہ پڑا رہنے کے حق میں ہے۔

ویلیں۔

یس آف کورس۔ دس از آل رلیش اینڈ نان سنس، بٹ دا نیوز پیپر جسٹ
ڈ وانٹ ٹو بکیم اے متھ، کیونکہ اخبار وہ باتیں کرتا ہے جو عملاً ممکن الحصول نہیں۔

ہاہا - اے متھ، تاکہ لوگ متھ کے انتظار میں ختم ہو جائیں۔

حالانکہ اس روشنی کے دور میں متھس کیسے پیدا ہو سکتی ہیں

اور کیا متھس کے لئے ضروری ہے کہ رومان کے دھندلکوں میں لپٹی ہوئی ہوں۔

"تو پھر طے کیا ہوا - ؟"

یہی کہ ہماری سوسائٹی میں جس بات کی شدت سے تردید ہو رہی ہو اس کے اثبات
کا یقین کر لو۔

اُوسٹیلی او رئیلٹی

یس آف کورس، دس از اے رئیلٹی۔

لیکن یار، کتنا عیب ہے۔ میرا مطلب ہے کہ ہماری سوسائٹی میں
وہ تو ہے،

بریتھنگ اسپیس تک کا احساس نہیں ہوتا

مگر راوی تو چین ہی چین لکھتا ہے یعنی اخبار کہتا ہے کہ سب خیریت ہے۔

یہی تو میں کہہ رہا ہوں کہ جو نہیں ہے اسے کہتے ہیں کہ کچھ ہے اور جو ہے - ؟

اسے کہتے ہیں کہ کچھ نہیں ہے۔

ہم کیسی قوم ہیں - یہ ہے اس وقت کا سب سے اہم سوال

زعم باطل میں مبتلا رہنے والی اور حقائق سے چشم پوشی کرنے والی

وہ تو ہم ہیں۔ مگر ہماری تاریخ۔

دور سے دیکھو تو خوبصورت نظر آتی ہے، اندر جھانکو تو خلا ہی خلا یعنی ہم

نے خود کو بار ہا کھوکھلا بنایا ہے اور خوبصورتی وہ کہ اپنے منہ میاں مٹھو والی۔ توبہ توبہ ہم ایسی قوم ہیں جو قسطوں میں خودکشی کے عمل سے گزر رہی ہو۔

اصل میں معاملہ خلوص اور وفاداری کا ہے ہم خود اپنے آپ سے نہ وفادار ہیں اور نہ مخلص۔

ہم تو شاید خدا پہ بھی یقین نہیں رکھتے کہ زبان سے اللہ اللہ کرتے ہیں اور عملاً اس یقین کی نفی کرتے رہتے ہیں۔

عملاً تو یہی ثابت کیا ہے کہ ہر لمحے خدا کا نام جپنے والی قوم نہ خدا پہ یقین رکھتی ہے اور نہ یوم آخرۃ پہ۔

کیونکہ ساری خرابیاں اور برائیاں پیدا ہی اسی لئے ہوئی ہیں کہ یہ قوم "آج" پہ یقین رکھتی ہے۔ "صرف آج پہ"

اور ہر فرد "خود" پہ بھروسا کرتا ہے صرف خود پہ، خدا پہ نہیں اور خودی پہ تو بالکل ہی نہیں۔

ہاں آنے والا کل اور گزرا ہوا کل بے معنی بن کر رہ گئے ہیں ہمارا دونوں سے ناتہ ٹوٹا ہوا ہے ہم خود پسند اور خدا فراموش قوم ہیں مگر خوش فہمی کی افیون میں انٹاغفیل ہی ہیں، وشفل تھنکنگ پہ زندہ رہنے والی قوم۔

لیکن ہمیں ایسا بنایا گیا ہے، ہم ایسے تھے نہیں، کیا خیال ہے؟

یہ ایک الگ سوال ہے مگر جو ہم ہیں سوچو کہ ہم کیا ہیں یہ زیادہ اہم ہے نا؟

آخر جیوز کیا ہیں، میرا مطلب ہے یہودی۔

ہماری ترقی یافتہ شکل، آخر ہم ان کو برا کیوں کہتے ہیں، ان میں برائی کیا ہے۔

ہم سے بدرجہا بہتر ہیں قوم پرست تو ہیں قوم شکن تو نہیں۔

وہ بہت روئے، دیوار گریہ کے سائے میں بیٹھ کر اپنے کیے پر بہت

پچھتائے اور اب . . .

ہمیں تو رونے کا بھی ہوش نہیں کہ ابھی تو دنیا ہم پر ہنس رہی ہے۔

اور جب رونے کا وقت آئے گا تو ہمارے لئے دیوار گریہ بھی نہ ہو گی،

شاید، کیا خیال ہے؟

یار کیوں نہ ہم اس ملک کو چھوڑ دیں، یعنی ہم دونوں۔

اس سے کیا ہو گا، کیا قوم کا مسئلہ حل ہو سکے گا اور پھر یہ بھی تو فرار ہوا نا حقائق سے فرار، مشکلات سے فرار۔ فائدہ، فائدہ یہی کہ آنکھ اوٹ پہاڑ اوجھل یہ نہ دُکھ دیکھیں گے نہ غم ہو گا چلو فرار ہی سہی کیا مضائقہ ہے۔

کہاں جائیں ہم کہاں جائیں آخر، ٹھکانہ ہے کوئی ایسا جہاں عافیت ہو جہاں کی زمین اور آسمان ہمیں پناہ دے سکیں یورپ کے کسی ملک چلے جائیں، مشرق وسطیٰ میں نکل جائیں امریکہ یا پھر۔

کیا وہاں رہ کر ہم اپنی شناخت مٹا سکیں گے؟

نہیں۔

پھر؟

مگر یہ گھٹن یوں لگتا ہے کہ اس حبس میں دم نکل جائے گا یہاں تو!

گھٹن وہاں بھی ہے۔

وہاں بھی ہے۔

وہاں ہم دوسرے درجے کے شہری ہوتے ہیں، اچھے برے دونوں معاملات سے دور، اور ہر حق سے محروم، اور یہ جو لوگ دبئی وغیرہ چلے جاتے ہیں۔

یہ تو بس پیسہ کمانے والی مشین کا محض ایک بے حس پرزہ بن کر رہ جاتے ہیں

اور یار یہ بھی اپنے وطن کو ترستے ہیں کیونکہ یہ خود اختیاری جلاوطنی ہے نا

اچھا؟

ہاں اور کیا، اور تم جانو کہ پیسہ جب ہاتھ میں آنے لگے تو اس کی وقعت

ختم ہو جاتی ہے۔ پیسہ ہی تو سب کچھ نہیں ہوتا۔

تو پھر ہم کریں کیا، کیا عالم جبر میں سسکتے رہیں؟

ہاں۔ صحرا میں اے خدا کوئی دلیوار بھی نہیں

ٹرو، ویری ٹرو۔ آئی مین غالب دی گریٹ۔

ٹمنشن ٹنشن، آل اوور دا ورلڈ، لوگ بیمار ہیں، کمزوڑدل انسان بیمار ہیں،

بلڈ پریشر اور ڈائیبٹیز میں مبتلا ہو ہو کر مرے جا رہے ہیں، مگر چند بدمعاشوں نے

ساری دنیا کو مصیبت خانہ بنا کر رکھ دیا ہے۔

ہاں ہمیں سنجیدگی سے سوچنا پڑے گا کہ ان کے چنگل سے شریف انسانوں کو،

معصوم انسانوں کو کیونکر نجات دلائی جائے، کیوں نہ ہم ایک کلب قائم کریں۔

کلب؟

ہاں ہاں کرلیں ایک کلب قائم۔ کیا مضائقہ ہے

مگر وہ کلب کیا کرے گا۔؟

شریف انسان اس کے ممبر بن کر سنس لیا کریں گے مزے سے رہیں گے

اپنی دنیا میں مگن۔

شرافت کی آئی ڈنٹٹی کیا ہو گی، یعنی ممبر شپ کی کی بیک کوالی فکیشن، کیا کوئی

بدمعاش یہ آکر نہیں کہہ سکتا کہ میں شریف آدمی ہوں مجھے اس کا ممبر بنالو، اور

پھر اپنی بدمعاشی۔

اوہ۔ نو

اوہ ایس،

پھر اس کا مطلب تو یہی ہوا کہ ہم سسکتے رہیں اور مرتے رہیں۔

میں نے قدرت کے حسین نظاروں، مصوروں اور فنکاروں کی دلفریب تخلیقات میں خود کو ڈبونا چاہا، دل و دماغ کو فریب دے دے کر سلانا چاہا۔ مگر مفر نہیں، کہیں مفر نہیں ۔ فرار فرار ہے یار۔

ہاں فرار فرار ہے، بیشک فرار فرار ہے تم سچ کہتے ہو۔

کیا یہ صرف ہمارا ہی حال ہے۔؟

نہیں، ہر ذی حس اور ذی روح اسی کرب میں مبتلا ہے۔

ایک بار میں اپنے دل کے اندر چپکے سے دبے پاؤں اتر گیا اور وہاں جا کر اس سے ملاقات کر کے مصافحہ کیا اور کہا کہو پیارے کیا حال ہے؟ کیسی گزرتی ہے پیارے دل؟؟

ہیں؟ دل کے اندر کیا بک رہے ہو؟

ہاں ہاں، جانتے ہو دل نے کیا کہا،؟

کیا کہا۔؟

اس نے ایک بڑا سا داغ دکھاتے ہوئے کہا اب جس جگہ کہ داغ ہے یاں آگے درد تھا۔

صرف ایک داغ،

ہاں صرف ایک داغ۔

میں نے جو اپنے دل میں جھانکا تو وہاں داغوں کے سوا اور کچھ تھا ہی نہیں۔

تم نے بھی جھانکا۔

شاید ہر شخص جھانکتا ہے، جب دنیا بھر کے دروازے اپنے اوپر بند پاتا ہے تو لوٹ کر آتا ہے۔

اور اپنے ہی دل پہ دستک دیتا ہے۔

ایک بار میری بھی وقت سے ملاقات ہوئی

وقت سے؟

ہاں ہاں وقت سے ملاقات ہو گئی

وقت تو سیال ہے، ٹھہرتا کہاں ہے، یار کیا اوٹ پٹانگ ہانک رہے ہو خواہ مخواہ بہک رہے ہو، یقین کرو نہ میں بہک رہا ہوں اور نہ اوٹ پٹانگ ہانک رہا ہوں۔ بقید ہوش و حواس باتیں کر رہا ہوں مگر وقت ہی تو جبر ہے، اسی جبر میں تو ہم مبتلا ہیں۔ اسی کا تو رونا رو رہے ہیں۔

وقت سے ہو گئی میری ملاقات، مان لو میری بات۔

اچھا اچھا، چلو مانے لیتے ہیں، پھر کیا ہوا؟

ہاں تو وہ بولا کہ میں تمہارے آگے بھی ہوں اور پیچھے بھی، حال بھی اور مستقبل بھی۔

ظاہر ہے کہ ہم ٹائم اور اسپیس کی مخلوق جو ہیں

مگر میں نے اس سے کہا کہ اسے وقت تو صرف حال ہے نہ ماضی ہے اور نہ مستقبل۔

"وہ کیسے؟"

وہ ایسے کہ ماضی مر جاتا ہے اور مستقبل کا کچھ بھروسا نہیں۔ گوتم کہاں ہے، پاٹلی پتر کدھر چلا گیا۔۔۔ وہ نروان کہاں ہے جو گوتم نے حاصل کیا تھا اور یہ کہ کل کیا کیا ہوگا، بلکہ پل میں کیا ہوگا، کیا ہمیں خبر ہے؟

موئن جو داڑو کہاں ہے؟ اور ماضی قریب بُت الاصنام پہ کیا گزری، وہ بھی ماضی یہ کیسی ماضی ۔۔۔ ہے کہ نہیں۔

ہونہہ۔

کیا ہونہہ ؟

یہی کہ شاید تم سچ کہتے ہو۔ سینٹ پرسنٹ سچ کہتے ہو۔
مگر میں نے سمندر سے ملاقات کی تھی۔

سمندر سے ؟ تمہاری ملاقات ۔ ملا ۔ قا ۔ ت، ہاہا

" ہاں ہاں سمندر سے، یقین کرو ہوئی تھی۔

اچھا پھر ؟

پھر کیا، سمندر کی وسیع اور عریض موجیں دوسری موجوں کا ہاتھ ....
تھامے بڑھتی چلی جاتی ہیں ۔ اور ۔ ساحلوں سے سر ٹکراتی تھیں اور پاش پاش
ہو جاتی تھیں، میں نے کہا اے سمندر یہ کیا ؟

وہ بولا، آتی ہوئی موجیں زندگی اور ٹکرا کر پاش پاش ہوتی ہوئی موجیں موت
ہیں موت کی تہہ میں زندگی ہوتی ہے، نئی زندگی، اسی سے نئی موج پیدا ہوتی ہے۔

اچھا ؟

اور کیا۔

تو پھر اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ۔

ہاں ہاں بالکل یہی ہوا جو تم سمجھ رہے ہو، وضاحت کی کوئی ضرورت نہیں۔

تو کیا ہر شخص سمجھ رہا ہے ؟

ہاں ہاں اور کیا کیونکہ ہر دل میں سمندر جو موجود ہے ۔

کھڑکی

سامنے. بالکل سامنے دیوار پر ٹوٹے ہوئے پنکھے کی تصویر آویزاں ہے تصویر کے پہلو میں کھڑکی کھلی ہے نیچے فرش پر بڑے بڑے پھول بوٹے پڑے ہیں۔ کھڑکی سے باہر کھلا ہوا آسمان ہے جہاں سے پہاڑوں کا سلسلہ نظر آتا ہے، پہاڑوں پر برف جمی ہے۔ اکا دکا ابر کے ٹکڑے تیرتے نظر آتے ہیں، ہوا سرد ہے۔ کھڑکی بند کرنے کی خواہش ہوتی ہے۔ مگر باہر کے نظارے سے نظر ہٹانا اچھا نہیں اس لیے میں نہیں بند کرتا۔

"ڈیڈی"

کھلونوں سے کھیلتے کھیلتے میری بچی بول پڑی ہے۔ "ہیلی کاپٹر وہاں پہاڑوں پر کیوں اُترا ہے؟"

"پولنگ بوتھ بنانے کے لئے آیا ہے۔"

"وہ کیا ہوتا ہے؟"

"وہاں ووٹ پڑتے ہیں۔"

"پر وہاں تو ایک ہی آدمی رہتا ہے۔ اکیلا آدمی۔"

"ہاں اسی اکیلے آدمی کے لئے تو بوتھ بن رہا ہے۔"

"بچی نے کھلونا اٹھایا اور نقلی رائفل میری جانب تان لی۔

"ہینڈز اپ"

میں دونوں ہاتھ اٹھاتا ہوں اور پیچھے جاتا ہوں۔ "بے بی آپ نے پھر وہی

کھیل شروع کر دیا۔"

"مجھے اچھا لگتا ہے۔"

"مجھے ڈر لگتا ہے بے بی۔"

میری بچی محفوظ ہو گئی اور رائفل لیے ہوئے باورچی خانے میں میری بیوی کو ڈرانے کے لیے چلی گئی اور میں تنہا رہ گیا۔ تنہا ہوتے ہی میں اٹھا اور اپنے ننگے پاؤں جاکر ان جوتوں میں ڈال دیئے جو فرش پہ پڑے ہوئے ہیں میرے پاؤں سات نمبر ہیں جوتے کسی طرح دس نمبر سے کم نہ ہوں گے سوکھے کھنکھناتے فل بوٹ، جن کے اندر سے مرے ہوئے چوہوں کی بدبو نکلتی ہے اور مجھے مرے ہوئے چوہوں سے سخت نفرت ہے، میری بیوی کو بھی نفرت ہے میری بچی بھی شدت سے نفرت کرتی ہے مگر ہم سب کی خواہشوں کے خلاف یہ جوتے یہاں رکھے ہوتے ہیں۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس قدر شدید نفرت کے باوجود میں اکثر ان جوتوں میں اپنے پاؤں کیوں ڈال دیتا ہوں، اگر میری بیوی اور بچی میری اس حرکت کو دیکھ لیں تو مجھے سخت سست سنائیں مگر مجھے پتہ نہیں کہ تنہائی کا ایک لمحہ بھی میسر آجائے تو میں اضطراری طور پر جوتوں کے قریب ضرور پہنچ جاتا ہوں جی تو یہی چاہتا ہے کہ انہیں اٹھا کر اتنی دور پھینک دوں کہ پھر کبھی یہ نظر نہ آئیں مگر میں کیا کروں مجبور ہوں۔ میری بیوی اور بچی بھی مجبور ہیں ہم نے اکثر چاہا کہ ان بوٹوں کی موجودگی کو ہم یوں نظر انداز کر دیں کہ جیسے یہ ہیں ہی نہیں جس طرح شتر مرغ اپنے سر کو چھپا کر سمجھتا ہے کہ وہ پورا کا پورا چھپ گیا اسی طرح اکثر اجنبی مہمانوں کے سامنے ہم ان بوٹوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں مگر کچھ ہی دیر کے بعد چھبتی ہوئی نگاہوں سے نکلتے ہوئے نفرت اور حقارت کے شعلے ہمیں اپنی غلطی کا احساس دلاتے ہیں اور ہم سب شرمندہ ہو جاتے ہیں ان جوتوں کی موجودگی میں ہمارے کمرے کا نفیس ماحول غارت ہو جاتا ہے اور ہمیں یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے تاریخ نے ایک بار پھر اعادہ

گیا اور یہ بادشاہی مسجد کو پھر اصطبل بنا دیا گیا، نعوذ باللہ۔

میری بیوی نے اپنی سہیلیوں کو بلانا ہی چھوڑ دیا۔ میری بچی تک اپنی کلاس فیلوز کو یہاں مدعو کرنا مناسب نہیں سمجھتی، ہم سب کے سب بڑے ذہنی کرب کا شکار ہیں اب تو ہم ان کمبخت جوتوں کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے مگر یہ ہمارے لاشعور میں ہر وقت ڈٹے رہتے ہیں۔

"اُف"

چائے کا کپ لئے ہوئے میری بیوی داخل ہوئی تو میرے پاؤں جوتوں کے اندر گھسے ہوئے دیکھ کر تلملا اٹھی۔

"یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟"

میں شرمندہ ہو گیا۔

"بالو — میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں۔ یہ کمبخت میرے پاؤں کے بھی نہیں آتے۔"

"اجڈ"

میری بیوی نے گالی دی، معلوم نہیں مجھے یا جوتوں کو لیکن میں نے یہی سمجھا کہ جوتوں ہی کو دی ہے میں اچھل کر جوتوں کے باہر آمد ہوا اور چائے کا کپ لے کر کرسی پہ جا بیٹھا شال پیروں پر ڈال لی اور چائے پینے لگا۔

"ہیلی کا بیڑا اتر گیا"؟

"ہونہہ"

"عجیب بات ہے ایک آدمی کے ووٹ کے لئے اتنا اہتمام۔"

"رائے ایک آدمی ہی کی کیوں نہ ہو جمہوریت کے تقدس کی۔"

"میں کھڑکی بند کر دوں"

"کیوں"

"سردی ہے"

"ہے تو سہی مگر آسمان تو نظر آتا ہے"

میری بیوی کرسی کے ہتھے پر میرے قریب ہی بیٹھ گئی اور پیار سے میرے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی اور آہستہ سے بولی:

"رات بھر میں نے خواب میں دیکھا"

"پھر؟"

"ہاں"

"کیا؟"

"وہی"

"وہی تو خواب میں بھی دیکھتا ہوں"

"اسی لمحے میری بچی بھاگتی ہوئی آئی اور بولی"

"ڈیڈی رات میں نے خواب میں دیکھا"

"تم نے بھی خواب دیکھا؟"

"جی ڈیڈی، میں نے دیکھا — میں نے دیکھا"

"کہ یہ جوتے —"

"ارے آپ کو کیسے معلوم ڈیڈی"

ہم دونوں میاں بیوی سر نیہوڑا کر بیٹھ گئے — جیسے ہم مجرم ہوں۔

سامنے بالکل سامنے دیوار پر ٹوٹے ہوئے پنکھے کی تصویر آویزاں ہے تصویر کے پہلو میں کھڑکی کھلی ہے نیچے فرش پر دو بڑے بڑے گل بوٹے پڑے ہوئے ہیں کھڑکی سے باہر کھلا ہوا آسمان ہے جہاں سے پہاڑوں کا سلسلہ نظر آتا ہے پہاڑوں پر برف جمی ہے۔ اکا دکا ادھر سوکھے پیڑ نظر آتے ہیں ہوا سرد ہے۔ کھڑکی بند کرنے کی خواہش ہوتی ہے مگر باہر کے نظارے سے نظر ہٹانا اچھا نہیں اس لئے میں نہیں بند کرتا۔

اشفاق احمد

سفر مینا	(افسانے، سفرنامے، ناولٹ)	۶۰/۰۰
توتا کہانی	(ڈرامے)	۱۰۰.۰۰
ایک محبت سو افسانے	(افسانے)	۲۱/۰۰
مہمان بہار	(ناولٹ)	۱۸/۰۰

بانو قدسیہ

راجہ گدھ	(ناول)	۶۰.۰۰
آدھی بات	(ڈرامے)	۱۵.۰۰
توجہ کی طالب	(افسانے)	۱۰۰/۰۰

ممتاز مفتی

علی پور کا ایلی	(ناول)	۲۰۰.۰۰

انتظار حسین

بستی	(ناول)	۳۵.۰۰
علامتوں کا زوال	(تنقیدی مضامین)	۲۵.۰۰

ڈاکٹر سلیم اختر

کڑوے بادام	(افسانے)	۵۰.۰۰

محمد اختر ممونکا

پیرس ۲۰۵ کلومیٹر	(سفرنامہ)	۵۰.۰۰
آ بیل مجھے مار	(سفرنامہ)	۶۰.۰۰
سفر تین درویشوں کا	(سفرنامہ)	۴۰.۰۰

سنگ میل پبلی کیشنز ۔ لاہور

بانو قدسیہ کا
نیا ناول
راجہ گدھ
قیمت — ۶۰ روپیہ
پبلشرز: سنگ میل پبلیکیشنز لاہور ۲